اور منطق و فلسفہ کی کتابوں کی فہرست ہے، اور پانچویں جلد میں حساب، ریاضی، طب، طبیعیات، زراعت، کیمیا، ہیئت، نجوم، فلکیات، علم الحروف، اخلاق، سیاست مدن اور حرب و مغازی کی کتابوں کا ذکر ہے، فہرست میں تصنیف و مصنف اور کاتب کے نام، سنہ وفات، مخطوطہ کے زمانۂ تحریر و تصنیف صفحات اور سطروں کی تعداد، شان خط، سائز اور مکمل یا ناقص ہونے کی تصریح کی گئی ہے، زہد و تصوف میں سنی، شیعہ اور زیدیہ فرقوں کی کتابوں کی علٰحدہ علٰحدہ وضاحت ہے،

دونوں جلدوں کے مختصر مقدمہ میں ان کے مخطوطات کی تعداد اور زیادہ قدیم مخطوطات کے نام اور اہم خصوصیات تحریر کی گئی ہیں، فہرستوں کی اشاعت سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملتی ہے، دونوں جلدوں کی ترتیب و تدوین کی خوبی کے لیے فاضل مرتب کا نام ہی پوری ضمانت ہے۔

ذکر سیّدین: - مرتبہ جناب شمسی طہرانی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۵۹ مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپئے۔ پتہ: (۱) کتبخانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی (۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

خواجہ غلام السیدین مرحوم ملک کے مشہور ماہر تعلیم، اردو و انگریزی کے لائق فاضل اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مایۂ ناز فرزند تھے، جناب شمسی طہرانی نے زیر نظر کتاب میں انکی زندگی کے خط و خال، فضل و کمال اور افکار و نظریات کو خود انکی اور دوسرے ارباب قلم کی تحریروں کی مدد سے پیش کیا ہی، پہلے انکی خاندانی نجابت، تعلیم، مدت ملازمت، وردھا اسکیم میں کارنامے، مسلم یونیورسٹی اور دوسرے تعلیمی اداروں سے دلچسپی اور انکی محبوب شخصیتوں کا ذکر کیا ہی، پھر انکے طرز تحریر اور مرقع نگاری کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، اور انکے قومی، سیاسی اور تعلیمی خیالات اور ذہنی و اخلاقی عظمت، رواداری، امن پسندی اور حب الوطنی کی مصوری کیگئی ہی، گو اس مختصر کتاب سے خواجہ صاحب کی سوانح عمری کا مکمل حق ادا نہیں ہوسکتا، تاہم اس سے انکے آیندہ سوانح نگاروں کو مدد ملے گی، اس حیثیت سے یہ کتاب مفید ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۰ - ماہ صفر المظفر ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۷ء - عدد ۲

مضامین

شذرات

مقالات

شذرات

آہ! رشید احمد صدیقی

ابھی مولانا عبدالماجد دریابادی کی وفات کا غم تازہ ہی تھا کہ اردو زبان کے ایک اور صاحب کمال، صاحب طرز اور صاحب فن ادیب اور انشا پرداز یعنی یگانۂ روزگار، فخر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مایۂ ناز فرزند شیراز ہند جناب رشید احمد صدیقی کی رحلت کی خبر ملی۔

دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

وہ مڑیاہو ضلع جونپور کے رہنے والے تھے، علی گڑھ میں چھ سال تعلیم پائی، یہاں کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تو یہیں کے ہو کر رہ گئے، اسکی روایات کے رازداں، اسکی حمیت کے دیدباں، اسکی عزت کے نگہبان اور اسکی آبرو کے پاسبان بنکر ساری زندگی گذاری، وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ایک اہل دل مسلمان نقاش اور مصور کا شاہکار سمجھتے رہے، سیاحوں کو جو دل آویزی اور رعنائی اجنٹا اور ایلورا میں نظر آتی ہے، وہی انکو گھر بیٹھے مسلم یونیورسٹی میں نظر آتی رہی، شاہجہاں ثمن برج میں بیٹھکر تاج محل دیکھا کرتا، پھر اسی برج میں اس نے ایک چھوٹا سا شیشہ نصب کرا رکھا تھا جس میں تاج محل کا پورا عکس پڑتا رہتا، رشید صاحب کیلئے علی گڑھ میں انکا مکان انکا ثمن برج تھا جس کے اندرونی حصہ میں ایک خوبصورت لہلہاتا سبزہ زار تھا، اسکے بیرونی حصہ میں طرح طرح کے گلاب کے پودے لگے رہتے تھے، یہیں سے اپنے شیشۂ دل میں اپنے ذہن کے تاج محل یعنی مسلم یونیورسٹی کو دیکھکر خوش ہوتے رہتے، اب اسی تاج محل کے اندر مدفون ہیں جس کی سرزمین نے انکے جسد خاکی کو نہیں بلکہ مسلم یونیورسٹی کے نشاط روح، سوز سینہ اور دل بیقرار کو بڑے شوق سے اپنی آغوش میں لے لیا ہوگا، وہ جا چکے مگر اپنی کتاب "آشفتہ بیانی میری" میں علی گڑھ کیلئے یہ پیام چھوڑ گئے ہیں کہ زمانہ بدلتا رہتا ہے، بدلتے رہنا اسکی تقدیر ہے، علی گڑھ اس تقدیر سے باہر نہیں ہے، اسلیے وہ بھی بنتا بگڑتا رہیگا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ہر تبدیلی کی زیادہ سے زیادہ اچھائیوں اور کم سے کم برائیوں کو قبول کرے گا۔

وہ ادبی دنیا میں ایک مزاح نگار کی حیثیت سے داخل ہوئے "طنزیات و مضحکات" لکھکر اس فن کو سیکھنے اور سکھانے کی کوشش کی، پھر خنداں اور مضامین رشید لکھکر سنجیدہ ظرافت اور ظریفانہ سنجیدگی دونوں کو ایک مستقل آرٹ بنادیا، شیخ نیازی لکھکر بچوں کو بھی کشت زعفران کے کنارے لاکر کھڑا کر دیا، انکے مضامین "دھوبی" اور "حاجی صاحب" کو پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے آب گیاہ سے خالی زمین کو لالہ زار اور بے مزہ زندگی کو مزیدار بنا سکتے تھے، شروع میں ان کا نام فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی اور پطرس بخاری کے ساتھ لیا جاتا تھا، مگر رفتہ رفتہ انکی صف سے نکل کر اپنی نئی راہ نکالی، وہ قہقہوں کے بجائے صرف موج تبسم کے قائل تھے، وہ صرف گدگدانے، گدگدا کر ہنسنے پر مجبور نہیں کرتے، دکھتی ہوئی رگ کو ضرور پکڑ لیتے، مگر اسکو مسل دینے سے گریز کر جاتے، انکے یہاں نیش عقرب ہوتا اور نہ نوک سوزن ہوتی، انکی بذلہ سنجی پر انکے ذوق کی عفت مآبی چھائی رہتی، جو حجاب شکن اور نہ نقاب پوش ہوتی مگر ہر حال میں محمل نشیں ہوتی، وہ شاعر نہ تھے، مگر اپنی مزاحیہ نثر سے شاعری کا کام لیتے رہتے، آخر میں تو اس میں غالب کی شوخی، داغ کا تیکھاپن، اکبر الہ آبادی کا اخلاقی درس، جگر کی دردمندی اور فانی کے غم کی معرفت پیدا ہو گئی تھی،

انکی علمی و ادبی تحریروں میں بڑی آب و تاب ہوتی، انکی وجہ سے دہلی اور لکھنؤ اسکول کی طرح اردو زبان کا ایک علی گڑھ اسکول بھی بن گیا ہے، وہ جب کوئی تحریر لکھتے اس میں اردو کے ساتھ علی گڑھ یا علی گڑھ کی کسی شخصیت کا ذکر ضرور لے آتے، انکو خود اعتراف ہے کہ ان میں انداز گل افشانی گفتار علی گڑھ ہی کے پیمانہ و صہبا سے آیا، انکی تحریروں میں مشرقیت کے احترام کے ساتھ مغربیت کا پاس خاطر بھی ہوتا، جن میں خوش طبعی، شائستگی اور خیراندیشی کے آبدار موتی بھی جھلملاتے رہتے، اپنے محبوب معاصروں اور خصوصاً علی گڑھ کے کسی نامور فرزند کی وفات پر کوئی ماتمی تحریر لکھتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ اسکی تربت پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے ہیں، مولانا محمد علی پر انکا نوحہ انکے قلم اور خود اردو ادب کی انشا پردازی کی بہترین مثال ہے، وہ انکے متعلق لکھتے ہیں کہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ ابوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کروپ کے کارخانے میں توپیں ڈھلنے والی ہیں، یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج محل کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے، ...... محمد علی کو بد توفیقوں اور بد مذاقوں سے سابقہ پڑا، ایسے بد توفیق اور بد مذاق بھوکے تھے، بوالہوس اور اکثر کینہ پرور بھی، محمد علی نے ان سب سے انتقام بھی لیا، لیکن اپنی زندگی میں نہیں

بلکہ اپنی موت ہے...... ایسا حسین کہاں جس کو خود یزید کی تلاش ہو" — آج کون ہے جو ایسے ڈھلے ترشے اور کندن کی طرح چمکتے ہوئے جملے لکھ سکتا ہے، انکی گنج ہائے گرانمایہ اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ بنی رہے گی۔

وہ اپنے زندہ معاصروں میں سے کسی پر کچھ لکھتے تو اس میں بھی خاص رنگ و بو پیدا کر دیتے، انکی کتاب "ہمارے ذاکر صاحب" ڈاکٹر ذاکر حسین ہی کی زندگی میں شائع ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے راشٹرپتی بنکر جب کبھی اسکو راشٹرپتی بھون میں پڑھا ہوگا تو ان کو یہ فیصلہ کرنا شاید مشکل ہوا ہوگا کہ راشٹرپتی کے مغل گارڈن کے سبزہ زاروں اور پھولوں میں زیادہ لہلہاہٹ اور شادابی ہے یا رشید صاحب کی اس کتاب میں، ان کی تحریروں کو پڑھتے وقت کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہو کہ ہم گوری چنبیلی کی روش کے بیچ میں کھڑے ہو کر بکھری ہوئی تجلی اور چھٹکی ہوئی چاندنی سے محظوظ ہو رہے ہیں، ان ہی کے انداز میں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ وہ اپنی تحریروں کی جنت میں ہمیشہ زندہ و قائم رہیں گے۔

انھوں نے اردو تنقید نگاری کے فن کی بھی امامت کی جس میں انکا رنگ بالکل ہی منفردانہ اور غیر مقلدانہ رہا، وہ جب یہ لکھتے ہیں کہ "غزل بدنام ہونے کے باوجود اردو شاعری کی آبرو ہے" "غالب نے اردو شاعری کو وزن اور وقعت دینے کے علاوہ ایک نسب اور ایک روایت بھی دی" "بعض احباب کہتے رہتے ہیں کہ غالب ایک زوال آمادہ تمدن، جاگیردارانہ نظام یا روایتی شاعری کے چراغ رہگذر باد تھے، تو یہ الزامات ہیں اصولی تنقید نہیں، آئین نہیں، آرڈیننس ہے" "جدید اردو میں ان تمام صالح، دلکش اور دقیق عناصر کی جلوہ گری ملتی ہے جن سے خود علی گڑھ عبارت ہے" "اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے، حاتم طائی کے کوہ ندا کی مانند وہ اپنی بھی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے" "اقبال کبھی حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے خلاف لیکن بالآخر دونوں" تو ان جملوں میں نہ صرف نیا پن ہے بلکہ نظر و فکر کی گہرائی بھی ہے، انھوں نے غالب، اقبال، اکبر الہ آبادی، اصغر، فانی پر جو کچھ لکھ دیا ہے اس میں آئندہ نسلوں کیلئے بھی کہنگی محسوس نہیں ہوگی، اس سے ہر زمانہ میں روشنی ملے گی اور ذہن میں جلا پیدا ہوتی رہے گی جس سے ان کے ادبی شعور کی پختگی کا اظہار ہوتا رہے گا۔

ان کو دار المصنفین سے بڑا گہرا لگاؤ تھا، وہ علامہ شبلی کی تحریروں کی رعنائی، برنائی، جمالیات کی رمز شناسی، انکے تخیل کی رنگینی اور جذبے میں حرارت اور تلملاہٹ کے بیحد قائل تھے، استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ علیگڑھ تشریف لیجاتے تو وہ انکی میزبانی بڑی محبت اور احترام سے کرتے، انکی وفات پر معارف کے سلیمان نمبر کیلئے گنج گرانمایہ کے عنوان سے جو مضمون لکھا وہ انکے بہترین مضامین میں شمار ہوتا رہے گا، اس میں انکے علمی تبحر، تحقیقی فراست، ذہنی تنقیحات، ادبی بصیرت، مورخانہ ژرف نگاہی، طالب علمانہ شغف، علوم پر محرمانہ نظر، مذہب کے معاملات میں بلند پائیگی، شریفانہ، دانشمندانہ اور عالمانہ رویہ، تقریر کی اثر آفرینی اور صلح جوئی کے ساتھ ساتھ انکے وضع قطع میں نفاست اور رکھ رکھاؤ کی مدح بڑی فراخدلی سے کی ہے، انکی اس رائے پر کہ وہ بحیثیت طالبعلم علامہ شبلی سے متاثر ہوئے اور بحیثیت معلم سید صاحب سے، انکے مرتبہ شناسی میں مدد ملے گی اور یہ غور و فکر کی بھی دعوت دیتی ہے، وہ مولانا عبد السلام ندوی کی تصانیف کی منطقیانہ ترتیب کے معترف تھے، کہتے کہ پیچیدہ مسائل کو سلجھا کر لکھنے میں انکی ہمسری کوئی نہیں کر سکتا، انکی اقبال کامل کے متعلق بار بار کہا کہ یونیورسٹیوں میں اقبال اسی کتاب کے ذریعہ سے سمجھے گئے، وہ جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے ادبی ذوق کے بھی مداح تھے، معارف کے سلیمان نمبر کیلئے انھوں نے اپنا مضمون انکے پاس یہ لکھکر بھیجا کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں کتر بیونت کر سکتے ہیں، انکی ترمیم و اصلاح سے انکو پورا اتفاق ہوگا، یہ انکی کسر نفسی کا بھی ثبوت تھا۔ یہ راقم علی گڑھ جب بھی گیا ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر اٹھا، جب اپنی کتاب "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" لکھ رہا تھا تو ان کو یہ کچھ ایسی پسند آگئی کہ اس کو جلد از جلد طبع اور شائع کرنے کی فرمائش کرتے رہے، اس کا اعتراف ہے کہ ان ہی کی حوصلہ افزائی سے یہ دو جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

ان کے فرشتہ صفت چھوٹے بھائی جناب نیاز احمد صدیقی صاحب شبلی کالج میں انگریزی کے لکچرر تھے، جن کا قیام عرصۂ دراز تک شبلی منزل کے احاطہ ہی میں رہا، اس لیے وہ جب کبھی اعظم گڈھ آئے تو یہیں قیام کرتے، وہ مولانا مسعود علی ندوی کی خوش سلیقگی اور خوش انتظامی، یہاں

کی خاطر مدارات، مہمان نوازی، رفقاء کے میل محبت اور کام کرنے کے شغف سے متاثر ہوتے، انھوں نے اپنے ایک مضمون میں جہاں یہ تحریر فرمایا کہ بہت سے دانایان سیاست، اربابِ فضیلت اور شیدائیان شعر و ادب اس سے نسبت رکھنا اپنے لیے ایک امتیاز سمجھتے تھے، وہاں بھی لکھا کہ اعظم گڈھ کا یہ مختصر سا خطہ جو کسی طرح ایک اوسط درجہ کے باغ کے رقبہ سے زیادہ نہیں ہے، شمالی ہند کی روایتی تہذیب و دانش و بینش کی نہ صرف نمایندگی کرتا رہا بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافہ بھی کرتا رہا" —— یہ خاکسار جب جب دار شبلی منزل کی اس روایتی تہذیب کو برقرار رکھنے کی بھی ضرور نصیحت کی، وہ معارف کے شذرات کو بہت شوق اور پابندی سے پڑھا کرتے تھے، حضرت سید صاحبؒ نے اس کے لکھنے میں جو معیار قائم کیا تھا اس کو قائم رکھنے کی تلقین اپنی ملاقاتوں میں برابر کرتے رہتے، ان سطروں کے لکھتے وقت ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ان کی وفات سے دار المصنفین اپنے ایک بہت ہی دلنواز اور شفیق بزرگ اور قدرداں سے محروم ہو گیا،

انکی رحلت کے بعد علی گڑھ کے چمن کی نرگس خدا جانے اپنی بے نوری پر کتنے دنوں تک روتی رہیگی علی گڑھ والے جب ان کو یاد کرینگے، ان کے دل سے یہ آواز نکلے گی

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

وہ اردو زبان کے حبیب تھے، بلکہ وہ خود اسکے محبوب بنگئے، وہ اردو ادب کے عاشق زار تھے مگر اردو ادب نے خود انکو اپنا معشوق بنالیا، انھوں نے اپنے محبوب ذاکر صاحب کے لیے جو کچھ کہا تھا وہی ان کیلئے اردو ادب اپنی زبانِ حال سے کہتا رہیگا،

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

علی گڑھ کیلئے انکے سینہ میں ایک سوز سلگتا رہا، یہ سوز سینہ ہندستان کے مسلمانوں کے افتخار، وقار اور سربلندی کیلئے تھا، یہی انکا توشۂ آخرت بنے گا جو ممکن ہے کہ جنت کی حوروں کے گیسوؤں کیلئے شمامہ بنجائے۔ آمین، انھوں نے کسی موقع پر لکھا تھا کہ مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لونگا: غالب، اردو اور تاج محل — اگر اس راقم سے پوچھا جائے کہ ایم۔ اے۔ او کالج نے ہم کو کیا دیا تو میں یہ کہونگا، خوبصورت یونی فارم، مسلم یونیورسٹی اور رشید احمد صدیقی،

آہ! جناب فخر الدّین علی احمد صاحب صدر جمہوریۂ ہند

معارف کے اس شمارہ کی طباعت ہو چکی تھی کہ یکایک ریڈیو سے صدر جمہوریۂ ہند کی المناک رحلت کی خبر ملی، ملک اسقدر جلد ان کی دائمی جدائی کے لیے تیار نہ تھا، فلک کا کیا بگڑتا جو نہ وہ مرتے کوئی دن اور، پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور اب جناب فخر الدین علی احمد کی وفات راشٹرپتی بھون ہی میں ہوئی، دونوں کی صدارت کے ساتھ

پیچھے پیچھے وہ دبے پاؤں قضا بھی آئی

وہ جا چکے، جب اُن کی سوانح عمری لکھی جائے گی تو وہ ایک پُرجوش مجاہد آزادی، قابلِ فخر محبِ وطن، کامیاب بیرسٹر، آسام کے معزز ایڈووکیٹ جنرل، اسی ریاست کی حکومت کے قابل اعتماد وزیر خزانہ، پھر ملک کی لوک سبھا کے ہر دلعزیز ممبر، اقوام متحدہ کے ہندستانی وفد کے بڑے لائق رکن، مرکزی حکومت کے مختلف محکموں کے بہت ہی کارگزار وزیر، سیکولرزم کے بہترین نمایندہ، قومی یکجہتی کے زریں نشان اور آخر میں جمہوریۂ ہند کے محبوب صدر کی حیثیت سے برابر یاد کیے جائینگے، ہندستان کی خارزار سیاست میں داخل ہو کر کسی مسلمان رہنما کا کامیاب ہونا آسان نہیں، کچھ مسلمان قائد ایسے ہوئے جو مسلمانوں میں تو مقبول تھے لیکن ہندوؤں میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے گئے، اور کچھ مسلمان لیڈر ایسے بھی گذرے جو ہندوؤں میں تو محبوب لیکن مسلمانوں میں غیر محبوب رہے، جناب فخر الدین علی احمد صاحب کا نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ دونوں حلقوں میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے گئے، ان کے کسی اخباری بیان یا کسی عمل کی نشاندہی نہیں کیجا سکتی ہے جس سے ہندو خوش اور مسلمان ناخوش یا مسلمان خوش اور ہندو ناخوش ہوئے۔

انکی علم نوازی کی یادوں کی بھی مشعل روشن رہے گی، ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی پورے ملک میں ان ہی کی خواہش پر بڑے اہتمام سے منائی گئی، ایوان غالب اور غالب انسٹی ٹیوٹ انکی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیں گے، ۱۹۷۵ء میں امیر خسرو کا سات سو سالہ بین الاقوامی جشن ان ہی کی سرپرستی میں بڑی کامیابی سے

منایا گیا، ملک کے بعض حلقوں میں اردو زبان سے جو بیزاری تھی ان کو رفع کرنے میں انکی مؤثر شخصیت بہت کارآمد ثابت ہوئی، مختلف ریاستوں میں جو علیحدہ علیحدہ اکیڈمی قائم ہوئی اس میں انکی ہدایت کو بڑا دخل ہا، انھوں نے اردو کی حمایت میں بھی ایسی مؤثر تقریر کی جس سے ایک ریاست کا غفلت شعار ضمیر بیدار ہوا، اردو کو ملک کے تہذیبی ورثہ میں واپس لانے میں انکی کوشش برابر جاری رہی۔

وہ دارالمصنفین کے بھی بڑے مربی رہے، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ہماری مجلس انتظامیہ کے بڑے قدیمی رکن تھے، انکی وفات کے بعد جب جناب فخرالدین علی احمد صاحب سے انکی جگہ پر یہاں کی رکنیت قبول کرنے کی درخواست کی گئی تو انھوں نے اپنے حسب ذیل گرامی نامہ میں یہ تحریر فرمایا، اس وقت وہ محکمۂ زراعت اور غذا کے وزیر تھے،

نئی دہلی ۲۰ ستمبر ۱۹۶۹ء

مکرمی! تسلیم - آپ کا گرامی نامہ ملا، آپ نے شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کا رکن بننے کی جو پیش کش کی ہے وہ بڑی عزت افزا ہے، دارالمصنفین کی خدمات ملک اور ملت کیلئے بہت مفید رہی ہیں، میں اسے فخر کی بات سمجھونگا کہ اس سے میرا رشتہ اور قریب تر ہو جائے، امید کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا۔

نیازمند: فخرالدین علی احمد

دارالمصنفین جب مالی پریشانیوں سے گذر رہا تھا تو انھوں نے اچ-ای-اچ نظام چیریٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کے صدر شہزادہ مفخم جاہ کو حسب ذیل مکتوب انگریزی میں تحریر فرمایا:

نئی دہلی ۲۹ مارچ ۱۹۷۱ء

مائی ڈیر پرنس مفخم جاہ! آپ کو معلوم ہے کہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ یو.پی اپنی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں میں تقریباً پچپن ۵۵ سال سے مشغول ہے، اس نے ایسی شہرت حاصل کرلی ہے کہ دوسرا کوئی بھی علمی ادارہ اس سے رشک کر سکتا ہے، اسکو ہندوستان کے ایک نامور فرزند مولانا شبلی نے قائم کیا جن سے اردو میں تاریخی تحریروں کی تحقیقات کی بنا پڑی اور اردو کے تنقیدی سرمایہ میں بڑا گرانقدر اضافہ ہوا، ان کی سیرۃ النبی علم و فضل کا شاہکار ہے۔

اس اکیڈمی کو ہز ہائینس نظام حیدرآباد کی طرف سے ہندوستان کی آزادی سے پہلے امداد ملتی رہی، بدقسمتی سے گذشتہ چند برسوں کے اندر اکیڈمی بعض مختلف اسباب کی بنا پر مالی پریشانیوں میں مبتلا ہے، یہ بڑی المناک ہوگی اگر یہ ادارہ بند ہو جائے یا اس کو اپنی علمی سرگرمیوں کو بڑی حد تک کم کرنا پڑے، اس کو ہز اگزالٹڈ ہائینس نظام ٹرسٹ کی طرف سے پانچسو روپے ماہوار کی امداد ملی ہے، اس سے جو اہم علمی کارنامے انجام پائے ہیں اور اس کے مالی ذرائع کی جو کمی ہے اس لحاظ سے یہ امداد بہت زیادہ نہیں، گو جو کچھ ملا ہے اسکا خیر مقدم کرنا بھی مناسب ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس ادارہ کے لوگ بہت شکر گذار ہونگے اگر ان کے لیے کوئی مستقل آمدنی کی صورت نکل آئے، میں آپکا ذاتی طور سے شکر گذار ہونگا اگر انکو آپ یکمشت ایسی رقم دیدیں جس سے اسکو پندرہ سو روپیہ ماہانہ کی آمدنی مستقل طور پر ہو جائے۔ بہترین خواہشوں کے ساتھ۔

آپ کا مخلص فخرالدین علی احمد

انکے اس مکتوب کے بعد دارالمصنفین کو یکمشت بڑی رقم تو نہیں ملی لیکن ایک ہزار ماہانہ کی امداد گذشتہ سال تک ملتی رہی جس کے لیے دارالمصنفین ان کا بیحد ممنون ہوا،

یہ راقم ان کی خدمت میں بارہا حاضر ہوا، ہر حاضری میں ان کی شرافت خلاق سے متاثر ہو کر اٹھا، جب ہندوستان و پاکستان کی آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا تو میں اپنی لڑکی کی شادی کیلئے کراچی جانا چاہتا تھا، تاخیر سے میری پریشانی بڑھ رہی تھی، میں نے جناب فخرالدین علی احمد صاحب کو ایک خط میں اپنی اس پریشانی کا اظہار کیا، انھوں نے ازراہ نوازش اپنے جواب میں یہ تحریر فرمایا کہ میں باضابطہ حکومت کو درخواست دوں اگر اجازت ملنے میں کوئی دشواری ہو تو میں انکو مطلع کروں، اس خط کے لکھنے کے بعد ہی وہ صدر جمہوریہ ہند ہو گئے، یہ خط میں نے ضلع کے سرکاری حکام اور اتر پردیش کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کو دکھایا تو پھر ضروری کارروائیوں میں بڑی آسانی پیدا ہوگئی، پھر بھی اس میں کافی تاخیر ہوگئی، میں نے ایک دوسرے خط میں اپنی پریشانی کا اظہار جناب فخرالدین علی احمد سے کیا، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے وزارت خارجہ کو ٹیلیفون کرایا کہ لکھنؤ کے علاقائی پاسپورٹ آفس کو ہدایت دیجائے کہ میرے لیے جلد پاسپورٹ بنا دیا جائے، وزارت خارجہ سے لکھنؤ

ٹرنک کال آیا، جس کے بعد پاسپورٹ لیکر میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ پاکستان روانہ ہوگیا، ان کا یہ احسان میرے اور میرے خاندان کے دل و دماغ پر برابر منقوش رہے گا۔

عابدہ احمد بیگم صاحبہ ابتک مسز اندرا گاندھی کے بعد ہندوستان کی معزز ترین خاتون سمجھی جاتی تھیں، وہ اپنے بلند اقبال شوہر کے مہر و محبت کے عطر میں بسی ہوئی زندگی بسر کر رہی تھیں اور اپنے کو ہندوستان کی بہت ہی خوش قسمت خاتون سمجھتی ہوں گی، جب یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں تو ان کے شوہر کی میت گلاب کے پھولوں کے انبار کے نیچے لوگوں کے آخری دیدار کے لیے رکھی ہوئی ہے، دہلی کے عقیدت مند شہری اس کو دیکھکر انکی زندگی کی کامیابی، انکے رتبہ کی بلندی، انکی بھلمنساہت کی خوبی اور انکی مرنجاں مرنج سیاسی حکمت عملی کو یاد کرکے ان کو آخری خراج تحسین پیش کر رہے ہونگے، اسکے بعد جنازہ پورے شاہانہ انداز میں اٹھیگا، ماتمی بگل کے بعد توپوں کی سلامی دیجائیگی، میت کی فوجی گاڑی پھولوں سے لدی ہوئی ہوگی، اسکے آگے خوش لباس سواروں کا دستہ ہوگا، اسکے پیچھے مغموم وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی، قائمقام صدر، وزراء، سفراء بیرونی ممالک کے ممتاز نمایندوں کی سواریاں ہونگی، بحری، بری اور ہوائی فوج کے ہزاروں لشکریوں کا جلو ہوگا، یہ ماتمی جلوس شان و شوکت کیساتھ نئی دہلی کی سڑکوں سے گذریگا، بیشمار شہری اپنے مرحوم صدر کو الوداعی اسلام کہہ رہے ہونگے، ان کے لیے دعائے مغفرت بھی کرتے جاتے ہوں گے، مگر انکی سوگوار اور غمزدہ بیوہ اس شاندار جنازہ کو دیکھکر اپنی زبان حال سے کہہ رہی ہوں گی،

مفہوم کائنات تمہارے سوا نہیں

تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا

مسز اندرا گاندھی ان کے غم میں برابر شریک ہوں گی، کیونکہ ان کو اپنی سیاسی زندگی میں کوئی اور راشٹرپتی ایسا معتمد علیہ شاید ہی ملے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو صبر جمیل اور مرحوم صدر جمہوریہ کو ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا فرمائے، آمین

رفتید ولے نہ از دلِ ما

مقالات

اسلام میں مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

یہ مقالہ پاکستان کی بین الاقوامی سیرت کانگریس میں کراچی کے اجلاس میں پڑھا گیا، جو مارچ ۱۹۷۶ء میں منعقد ہوئی تھی اب کچھ ترمیم و اضافہ کیساتھ معارف میں شائع کیا جارہا ہے۔ ص، ع

صدر محترم!

مجھکو خوشی ہے کہ میں سیرۃ النبیؐ کی اس بین الاقوامی کانگریس میں شریک ہوں جس کیلئے میں حکومتِ پاکستان کی وزارتِ مذہبی امور اور ہمدرد نیشنل فونڈیشن کا شکر گذار ہوں، میں اپنی حکومت ہند کا بھی ممنون ہوں کہ اس کی طرف سے یہاں آنے میں ہر قسم کی سہولتیں میسر ہوئیں، میں ہندوستان کی ریاست اترپردیش کے شہر اعظم گڈھ کے ادارہ دار المصنفین شبلی اکیڈمی کی نمایندگی کر رہا ہوں، مجھے یہ کہنے میں فخر محسوس رہا ہے کہ یہ وہ ادارہ ہے جہاں سے اردو میں سیرۃ النبیؐ پر اتنا قابل قدر لٹریچر شائع ہوا ہے کہ شاید ہی ایسا خزانۂ عامرہ کسی اور زبان میں ہو، اس کے بانی علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں ایک گدائے بے نوا بن کر شہنشاہِ کونینؐ کے دربار میں اپنے اخلاص و عقیدت کے جو نذرانے پیش کیے

ہیں، وہ تماشا کے لیے ایک گوہر بے بہا کی حیثیت رکھتا ہے حسن عقیدت کے جو پھول سینکڑوں چمن کدوں سے چن کر ان کے ہاتھ آئے تھے، ان کو آستانۂ نبوت پر اپنی زندگی میں تو نہ چڑھا سکے لیکن یہ سعادت ان کے فاضل اجل شاگرد اور میرے استاد حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کو حاصل ہوئی جنھوں نے اس خدمت کو بجالانے میں اپنی زندگی کے ۲۳ سال صرف کئے، وہ مصلحت خداوندی سے آپ ہی کی سرزمین کراچی میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

سیرۃ النبی کی تکمیل چھ حصوں میں ہوئی ہے، پہلے دو حصوں میں تو یہ پیش کیا گیا ہے کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات اقدس کے ساتھ کیا لائے تھے، بقیہ چار حصوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ آپ اپنے ساتھ کیا لائے اور دنیا کو کیا دے گئے، ان میں حالات طیبہ اور سوانح اقدس کے ساتھ آپ کے نفس معجزات کی حقیقت، مکالمۂ الٰہی، نزول ملائکہ، معراج اور شرح صدر کے بیانات کے بعد منصب نبوت کے لوازم و خصائص اور اسلام کے عقائد و عبادات کی تعلیمات کی توضیح کی گئی ہے، آخری حصہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پایہ کتنا اونچا تھا، ان حصوں کے علاوہ حضرت الاستاذ نے مدراس میں سیرت پر چھ خطبے دیے جو خطبات مدراس کے نام سے مشہور ہیں، یہ ان کی علمی و ادبی تصانیف کا شاہکار ہیں، پھر انھوں نے بچوں اور عورتوں کے لیے رحمت عالم لکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و تعلیمات کو عام کیا، ان ہی کی نگرانی میں صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ پر چودہ جلدیں لکھی گئیں جو آپ کی تعلیمات کے عملی نمونے تھے، ان ہی کے شاگردوں نے دین رحمت اور ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری لکھیں، جن میں اسلام کی فراخدلانہ تعلیمات کی مزید وضاحت کی گئی ہے، دار المصنفین کی ان مطبوعات سے ایک خاص ذہن اور مخصوص مکتبِ فکر کی نشو و نما ہوئی ہے، میرا یہ مقالہ اسی ذہن اور مکتب فکر کی محض آواز بازگشت ہے،

مجھکو اس وقت یہ کہنے میں پندار محسوس ہو رہا ہو کہ انسانیت کی تکمیل کیلئے جتنے فضائل اخلاق کی ضرورت ہو سکتی ہیں ان سب کی تعلیم ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اور ان پر خود عمل کر کے دکھایا، ایمان، تزکیۂ نفس، زہد، تقویٰ، عفت، پاکبازی، دیانتداری، شرم، رحم، عدل، عہد کی پابندی، احسان، عفو، درگذر، خودداری، شجاعت، استقامت، حق گوئی اور استغنا وغیرہ جو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمات ہو سکتی ہیں وہ آپ کے ذریعہ سے ہم کو ملیں اور جتنے رذائل ہو سکتے ہیں ان سب کی مذمت کی گئی ہے، ان تعلیمات کے بعد یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اسلام کا رب رب المسلمین ہی نہیں بلکہ رب العٰلمین ہے اور اس کا رسول رحمت للعٰلمین ہے، مگر ہمارے غیر مسلم ناقدین نے اسلام کے زور، جبر، جبرہ دستی اور عدم رواداری کی بہتان تراشی کی ایک مہم چلا رکھی ہے، کیوں؟ اس کی وجہ تو وہ خود بتا سکتے ہیں، مگر بظاہر یہ مہم یا تو ان کے مذہبی تعصب یا سیاسی مصالح یا اسلام کی تعلیمات سے ناواقفیت کی بناء پر جاری ہے، اگر یہ مذہبی اور سیاسی مصلحتوں کی بناء پر ہے تو یہ خود ان کی عدم رواداری اور متعصبانہ ذہنیت کا ثبوت ہے، اور اگر کسی مطالعہ کے بعد وہ غلط رائے پر قائم کرنے کے خوگر اور عادی ہو گئے ہیں تو ان کی اس مریضانہ ذہنیت کا شاید کوئی علاج نہیں،

دار المصنفین کے مکتب فکر نے اسلامی فن روایت و درایت کا یہ معیار قائم کیا ہے کہ سب سے پہلے ایک واقعہ کی نوعیت کو کلام پاک کی روشنی میں سمجھا جائے، اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو احادیث صحیحہ کا سہارا لیا جائے، اگر اس میں بھی ناکامی ہو تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے، سیرت کی جو روایتیں اعتبار کے لحاظ سے احادیث کی روایتوں سے فروتر ہوں انکے مقابلہ میں احادیث کی روایات کو ترجیح دیجائے، اگر احادیث کی روایتوں میں اختلاف ہو تو ارباب فقہ و ہوش کی روایتوں کی طرف رجوع کیا جائے، جو روایت عقلی وجوہ، مشاہدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف سمجھی جائے، وہ لائق حجت قرار نہ دیجائے، روایات آحاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت

کے لحاظ سے قبول کرنے کی کوشش کیجائے، روایت و درایت کا یہ معیار اسلام کے غیر مسلم نقادوں کے یہاں نہیں پایا جاتا، وہ اسلامی تاریخ کی کچھ جزئیات یا سنی سنائی روایات یا بعض نامعتبر کتابوں کے واقعات کو ماخذ بنا کر محض اپنے زور بیان اور عیارانہ قوتِ استدل سے بود کو نابود، نابود کو بود، وجود کو عدم، عدم کو وجود، سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا دیتے ہیں، مگر افسوس اس کا نہیں کہ غیر مسلم اسلام کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں بلکہ دکھ اس کا ہے کہ ہم آپ ان کی رائے سے متاثر ہو جاتے ہیں،

ہمارا مسلک تو یہ ہونا چاہئے کہ ہم انسانیت کو سنوارنے کے لیے اس دنیا میں ہیں، ہمارا رب ربّ العٰلمین ہے، اس کا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ رحمٰن اور رحیم ہے، اس کے کلام کا سرعنوان ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے، اس کی پہلی سورہ الحمد للہ رب العالمین، الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہے، اس کی تین سو سے زیادہ آیتوں میں اس کی صفتِ رحمت کا ذکر ہے، وہ غفور ہے، وہ توّاب ہے، وہ ذوالرحمہ ہے، وہ خیر الرّاحمین ہے، وہ کریم ہے، وہ حلیم ہے، وہ حفیظ ہے، وہ ستّار ہے، وہ غفّار ہے، وہ ذوالجلال والاکرام ہے، ہم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے ہیں، تو پھر رحیمی، کریمی، حلیمی اور ستّاری سے انحراف کر کے عدم رواداری، انسان دشمنی اور ایذا رسانی کو ہم اپنا وطیرہ کیسے بنا سکتے ہیں، ہمارا عقیدہ یہ بھی ہونا چاہئے کہ ہم دنیا کے لیے رحمت اسلیے بھی ہیں کہ ہم رحمۃ للعالمین کے پیرو ہیں۔

جب خداوند تعالیٰ نے اپنے آخری نبی یعنی ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کا پیام دیکر اس دنیا میں بھیجا تو ارشاد فرمایا :-

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء)

میں نے آپ کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

پھر فرمایا :-

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب - ۶)

اے پیغمبر ہم نے تجھکو گواہی دینے والا، نیکوں کو خوش خبری سنانے والا، غافلوں کو ہشیار کرنے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے پکارنے والا، اور ایک روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔

پھر تکرار ہے :-

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا)

ہم نے نہیں بھیجا ہے تم کو اے محمد لیکن تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے اور ہشیار کرنے والا بنا کر،

جب ہم رحمۃ للعلمین کے پیرو ہونے کے دعویدار ہیں تو ہمارا مقصد حیات یہ ہے کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں تمام انسانوں کو خوشخبری سنائیں، غافلوں کو ہوشیار کریں تاکہ اپنے رسول کے اسوہ کے پابند ہو کر روشن کرنے والا چراغ بن کر رہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول کو یہ حکم دیا

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل)

بے شک اللہ سب کے ساتھ عدل، احسان اور سلوک کا حکم دیتا ہے۔

پھر تاکید ہوتی ہے :-

اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص)

تم دوسروں کے ساتھ نیکی کرو اور بھلائی کرو جیسا کہ خدا تمہارے ساتھ بھلائی کرتا ہے۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ عدل، احسان، حسن سلوک، نیکی اور بھلائی ہماری زندگی کا بھی نصب العین ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کفر یعنی اس کے وجود سے انکار، اور شرک یعنی اسکی ذات میں کسی کی

شرکت کو پسند نہیں کرتا ہے، کافر اور مشرک اس کے باغی ہیں، وہ چاہتا تو کفر اور شرک کا تخیل انسانی ذہن میں پیدا ہونے ہی نہیں دیتا، یا کافروں اور مشرکوں کو صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹا دیتا، مگر دنیا میں برابر کفر بھی رہا اور شرک بھی، کافروں اور مشرکوں کو ہر قسم کا عروج بھی حاصل ہوتا رہا، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اپنے تمام بندوں کو اپنا فرمانبردار اور اطاعت گذار بنا کر ایک مسلک، ایک عقیدہ اور ایک مذہب کا پابند بنا سکتا تھا، مگر اس کا فرمان ہے کہ اس دنیا میں

مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف) — جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر اختیار کرے۔

لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (بقرہ) — دین کے بارے میں کسی قسم کا جبر نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتوں اور کثرت سے خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتوں کے لیے اجر مقرر کر رکھا ہے، اور ان کو اپنی رحمت کا بڑا حصہ دینے کی بشارت بھی دی ہے، اور ان کافروں کو جو اس کی باندھی ہوئی حدوں سے گذر جاتے ہیں، دردناک عذاب بلکہ ہمیشہ کے لیے آگ میں رکھنے کے انتباہ سے بھی آگاہ کیا ہے، مگر ان کو اس دنیا میں آزاد چھوڑ رکھا ہے جس سے اس کی قدرت کاملہ کی رواداری عیاں ہے، ان کو راہ راست پر اسلام کے پیام کے ذریعہ سے لانے کی ضرور تلقین کی ہے مگر اس طرح کہ

اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ (نحل ۱۲۵) — اپنے رب کے راستہ کی طرف دانشمندی اور اچھی اچھی باتوں کے ذریعہ بلاؤ اور بہت پسندیدہ طریقہ سے بحث کرو۔

اسی کے ساتھ اس کی بھی تلقین ہے کہ

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام ۱۳) — مسلمانو! جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہیں ان کو برا نہ کہو، یہ لوگ نادانی سے خدا کو برا کہنے لگیں گے۔

جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا آخری پیغام دنیا میں لائے تو آپ کو یہ حکم ملا کہ آپ کا کام صرف خدا کا پیام پہنچا دینا ہے اور بس

ان علیک الا البلاغ .... شوریٰ ۴۸

وان تولوا فانما علیک البلاغ .... نحل ۸۲

فان تولیتم فاعلموا انما علی رسولنا البلاغ المبین ..... مائدہ ۹۵

اگر لوگ روگردانی کریں تو اس کی ذمہ داری ان پر ہے، آپ پر نہیں، اسکے جوابدہ وہ ہونگے آپ نہیں، ان سے حساب لینا خدا کا کام ہے، آپ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ .... غاشیہ ۲۲

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ .... غاشیہ ۲۶

اور نہ آپ ان کے نگہبان و محافظ ہیں

وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ .... انعام ۱۰۷

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا .... بنی اسرائیل ۵۴

فَمَا أَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا .... نساء ۷۵

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کارساز ٹھہرا رکھے ہیں اللہ خود ان کا حال دیکھتا رہتا ہے

والذین اتخذوا من دونه اولیاء اللہ حفیظ علیهم شوریٰ ۶

جس نے اس کے رسول کے ہدایت کے مطابق سیدھی راہ اختیار کی وہ تو اپنے ہی لیے

اختیار کرتا ہے اور جو بھٹکا وہ بھٹک کر اپنا ہی کھوتا ہے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (بنی اسرائیل ۲)

اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہے۔

وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (بنی اسرائیل ۲)

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم دیتا ہے کہ اسلام کے پیام سے روگردانی کرنے والوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، ان پر کوئی زور، جبر اور نہ زبردستی نہ کیجائے، یہ رواداری کا پیام یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا ہے، خود اللہ تعالیٰ کو اس کا علم تھا کہ اس کے فرمانبردار بندوں یعنی اسلام کے پیرووں اور غیر مسلموں، کافروں اور مشرکوں میں تصادم ہوگا، اس لیے اس کی بھی ہدایت دی کہ جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انھوں نے تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا، بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔ (ممتحنہ ۱۰)

ایک اور جگہ ہے کہ جو لوگ تم سے لڑیں، اللہ کی راہ میں ان سے لڑو، لیکن کسی قسم کی زیادتی نہ کرو، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، (بقرہ ۱۹) یہ بھی حکم ہے کہ جب دشمن صلح کے لیے آگے بڑھیں تو ان سے صلح کرلی جائے، سورۂ انفال ۱۰ میں ہے کہ اگر کافر صلح کے لیے جھکیں تو تم بھی صلح کے لیے جھکو اور اللہ پر بھروسہ رکھو

یہود اور مسلمان کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہودیوں کا ذکر بہت ہی خفگی، تکدر بلکہ کراہت سے کیا گیا ہے، ان کے لیے پے در پے رسول بھیجے گئے، مگر انھوں نے سرکشی کی، کسی کو جھٹلایا، کسی کو قتل کر ڈالا (بقرہ ۸۰، و مائدہ ۷۳)، انھوں نے آخرت بیچ کر دنیا کی زندگی خریدی ہے (بقرہ: ۸۶) ان کے دل سخت ہو گئے ہیں، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں کیونکہ بعض پتھروں سے تو چشمے بھی پھوٹ بہتے ہیں (بقرہ: ۷۴)

بائیبل میں بھی ان کو خطاکار گروہ، بدکرداری سے لدی ہوئی قوم، بدکرداروں کی نسل، باغی جھوٹے فرزند، خدا کی شریعت کو سننے سے انکار کرنے والے کہا گیا ہے (باب ۱، آیت ۴-۵ باب ۳، آیت ۹-۱۴) بائیبل ہی میں ہے کہ انھوں نے حضرت سلیمانؑ کو شرک، بت پرستی، جادوگری اور زنا کے بدترین الزامات سے متہم کیا، انھوں نے حضرت داؤدؑ پر اوریاہ کی بیوی سے زنا کرنے کا بھی الزام لگایا۔

یہودیوں کی ان تمام مذموم حرکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انکے مغضوب ہونیکا فیصلہ کیا،

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ	یہ جہاں بھی پائے گئے اُن پر ذلت کی مار پڑی
مَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ	لیکن اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ
وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ	میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے، یہ اللہ
بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ	کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی و
عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ	بے چارگی مسلط کردی گئی ہے، اور یہ سب
كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ	کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی
وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ	آیات سے کفر کرتے رہے، انھوں نے
حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ	پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، یہ انکی نافرمانیوں
كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (آل عمران ۱۲)	اور زیادتیوں کا انجام ہے۔

ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کی غضبناکی کا اظہار ان کے مجموعۂ کتب مقدسہ میں یسعیاہ، یرمیاہ اور ان کے بعد آنے والے انبیاءؑ کی تمام کتابوں میں ہے، اللہ تعالیٰ کی اس غضبناکی کا اظہار حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کی ان متعدد تقریروں سے بھی ہوتا ہے جو اناجیل میں ہیں، اس کی توثیق کلام پاک میں اس طرح کی گئی ہے،-

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ (الاعراف - ۲)

اور یاد کرو جبکہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ اُن پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے، یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہودیوں نے جو زیادتیاں کیں اس کا ذکر آگے آئے گا، ان کی اسلام دشمنی مشہور رہی، چنانچہ کلام پاک میں ہے کہ وہ مسلمانوں کی خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے، مسلمانوں کو جس چیز سے نقصان پہنچے وہی اُن کو محبوب ہے، انکے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے، اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اس سے شدید تر ہے، ان کا بھلا ہو جاتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے، مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں، (آل عمران رکوع ۱۲)

کلام پاک میں یہ بھی ہے کہ یہ یہودی جھوٹی باتوں کی ٹوہ لیتے پھرتے ہیں، حرام مال کھاتے چلے جاتے ہیں مگر یہودیوں کی ان تمام نفرت انگیز برائیوں اور بداعمالیوں کے باوجود کلام پاک میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ ہدایت دی گئی کہ جب وہ لوگ تمہارے پاس اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے آئیں تو تم کو اختیار ہے کہ تم فیصلہ کر دو یا ان سے کنارہ کش رہو، وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، لیکن اگر فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو، کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (المائدہ ۴۲)

اس سے بڑھکر اور کیا مذہبی رواداری کا درس دیا جاسکتا ہے۔ اور اسکا عملی ثبوت ہمارے رسول صلعم کی سیرت طیبہ میں ملے گا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

آسمانی کتابوں کی صداقت پر ایمان

ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے رسول کے صحیفۂ وحی یعنی قرآن مجید

پر ایمان لائے، لیکن اس کیلئے قرآن مجید میں بھی لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کرے، کوئی مسلمان اُس وقت تک سچا مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ کلام پاک کے ساتھ اور دوسرے پیغمبروں کی کتابوں کو تسلیم نہ کرے، سورۂ بقرہ رکوع ۱۶ میں ہے کہ اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا، اُس پر اور جو کچھ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، خاندانِ یعقوبؑ کی طرف اتارا گیا، اس پر اور جو کچھ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا، اس پر اور جو کچھ اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، ہم ان سب پر ایمان لائے۔ (بقرہ ۱۶)۔ پھر آل عمران - ۹ میں یہی بات پھر دہرائی گئی ہے، اس سے انکار کو کفر قرار دیا گیا، سورہ نساء - ۲۰ میں ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا انکار کیا وہ نہایت گمراہ ہوا۔

کلام پاک میں صحفِ ابراہیمؑ، توریت، زبور اور انجیل کا ذکر تصریح کے ساتھ ہے، مگر کلام پاک ہی میں ہے کہ

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (النساء - ۲۳)

ہم نے تم سے پہلے رسول بھیجے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے ہیں کہ ان کے حالات تم کو سناتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جنکے حالات نہیں سناتے ہیں۔

اس کے یہ معنے ہیں کہ کچھ آسمانی کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا ذکر کلام پاک میں نہیں کیا گیا ہے، اسی لیے جس کسی صحیفہ میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں اس کو ہم بالتصریح خدا کی کتاب تسلیم نہ کریں تو تصریح کے ساتھ اس کا انکار بھی کرنے کا حق نہیں رکھتے، اسی لیے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب"۔ (صحیح بخاری کتاب التوحید و حدیث الافک)

اس سلسلہ میں حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی جلد چہارم باب "کتب الٰہی پر ایمان" میں تفصیلی بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

"حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا، یہ رواداری، بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے، یہودی اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے، عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے، ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی ہر آسمانی کتاب کو دجل و فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے، بودھ مت والے اپنے سوا دنیا کی تمام وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان حاصل کر سکتے ہیں، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کرے جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔" (جلد چہارم ص ۹۹-۵۹۸)

دنیا کی قوموں کے ساتھ رویہ

اسی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ رہی کہ مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں حسب ذیل قومیں ہیں (۱) اہل کتاب، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن مجید کو تو نہیں مانتے لیکن ان کتابوں میں سے کسی ایک کو تسلیم کرتے ہیں جن کا ذکر کلام پاک میں ہے، ان کے متعلق اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ اگر اسلامی حکومتوں کے وفادار شہری ہیں تو ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رکھی جائیں، ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہ کیا جائے، ان کی جان، عزت اور مال کی حفاظت کی جائے، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں، ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور اور ان کے جائز کھانے کھا سکتے ہیں۔ (۲) شبہ اہل کتاب، یعنی وہ لوگ جو ان آسمانی کتابوں میں سے کسی کو تسلیم نہیں کرتے جن کا

ذکر کلام پاک میں ہے، مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں، ان میں صابئی، مجوس، ہندو اور بودھ وغیرہ شامل ہو سکتے ہیں، اسلام کی تعلیم کے مطابق مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے ہیں، انکا ذبیحہ نہیں کھا سکتے، ان دو باتوں کے علاوہ ان کو اسلامی حکومتوں میں وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اہل کتاب کو دیے گئے ہیں، یعنی ان کی جان، عزت، آبرو، مال اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے، (۳) کفار اور مشرکین یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے، اور نہ وہ کسی مذہب کی پیروی کے دعویدار ہیں، اسلامی حکومتوں میں ان کو بھی امن دینے کی تعلیم دی گئی ہے، سورہ توبہ ۶ میں ہے کہ اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ چاہے تو اس کو پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے کلام کو سن لے، پھر اس کو اس کی جگہ واپس پہنچا دو، یہ اس لیے کہ یہ لوگ اسلام کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ (توبہ)

اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے کہ اس دنیا میں کچھ کفار اور مشرکین بھی رہیں، اس کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے :-

اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ جس کو چاہتا ہے راہ گم کر دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے کھول دیتا ہے، اور ضرور ایسا ہوتا ہے کہ تم سے ان کاموں کی باز پرس ہو جو دنیا میں کرتے رہتے ہو۔" (نحل-۶)

عہد رسالت میں کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ غیر مسلموں کے ساتھ نیکی کرنے یا ان کو صدقہ دینے سے ثواب نہیں ملتا، اس پر وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری جس سے مراد یہ تھی کہ ہدایت بخشنا مسلمانوں کا کام نہیں، وہ بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم سے نیکی کریں اور اپنی نیت ٹھیک رکھیں، ان کو اجر ملے گا، کلام پاک کی یہ آیتیں ہیں :

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ — تیرا ذمہ ان کو راہ پر لے آنا نہیں ہے

اللّٰہ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (بقرہ ۔ ۳۷)

اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو چاہے، اور تم جو دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا،

اس سلسلہ میں میرے استاذ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے، یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے لیے آمادہ کیا، مجوسیوں صائبیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی ان میں قوت پیدا کی (ج ۴ ص ۶۰۱)

رواداری میں رسول اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ

کلام پاک میں رواداری، فراخدلی اور انسان دوستی کی جو تعلیمات دی گئیں اُن پر ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کر کے بھی دکھا دیا جس کی تائید کلام پاک سے بھی ہوتی ہے، آل عمران ۱۵۹ میں ہے کہ بس خدا کی عنایت ہے تم ان کے لیے نرم ہو، اے محمد! اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو البتہ یہ لوگ جو تمہارے آس پاس جمع ہیں، تمہارے ارد گرد سے ہٹ جاتے، سورہ توبہ ۱۶ میں اللہ تعالےٰ نے آپ کے لیے فرمایا کہ آپ بھلائی کے بھوکے ہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، اس کے نزدیک سب سے پسندیدہ مخلوق وہ ہے جو اسکے کنبہ

کے ساتھ نیکی کرے (طبرانی وبیہقی)، آپ کی تعلیم یہ بھی رہی کہ ایک دوسرے سے تعلقات منقطع نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور خدا کے بندے! بھائی بھائی بن جاؤ (ترمذی ابواب البر والصلہ ما جاء فی الحسد) آپ کا یہ بھی اعلان ہے کہ جو شخص لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اس پر خدا بھی رحم نہیں کرتا (ترمذی ما جاء فی رحمۃ الناس) فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ دوسروں کیلیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، اور جب آدمی کسی کو دوست رکھے تو خدا کے لیے دوست رکھے (مسند احمد بن حنبل ج ۳ ص ۲۷۲) آپ نے یہ بھی ہدایت کی کہ تم لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، تب مسلمان ہو گے (ترمذی ابواب الزہد) اسلام کے دشمنوں کے مظالم سے تنگ آکر ایک مرتبہ صحابہ نے آپ سے ان کے لیے بددعا کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (مشکوٰۃ باب فی اخلاقہ وشمائلہ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے منصب نبوت کے فرائض انجام دینے میں جو رواداری اور فراخدلی دکھائی وہ انسانی تاریخ کی بہت ہی روشن اور تابناک مثال ہے، قریش، یہود اور نصاریٰ سب ہی نے آپ کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں مگر آپ نے ان سب کو بہت ہی صبر، تحمل اور بردباری سے برداشت کیا،

قریش کی ایذا رسانی جب آپ نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو قریش کے تمام سردار آپکے مخالف ہو گئے، جن میں ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف وغیرہ بھی تھے، ان کی کوشش ہوئی کہ وہ آپؐ کو اس قدر ستائیں کہ آپ اسلام کی تبلیغ سے باز آجائیں۔ مگر اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ جیسے سربرآوردہ اشخاص مشرف بہ اسلام ہو گئے تو قریش کو یہ کامیابی پسند نہ آئی، اس لیے انھوں نے آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو ایک جگہ محصور کر کے تباہ کر دیا جائے، کوئی شخص بنی ہاشم سے قرابت نہ کرے، ان کے ہاتھ خرید و فروخت نہ کرے، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دیا جائے، جب تک کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لیے حوالے نہ کر دیں، یہ معاہدہ در کعبہ پر آویزاں کیا گیا، بنو ہاشم مجبور ہو کر شعب ابو طالب میں پناہ گزیں ہوئے، جہاں وہ تین سال تک درخت کی پتیاں اور سوکھے چمڑے پکا کر کھاتے رہے، تین سال کے بعد کچھ رحمدلوں کو ترس آیا تو اس معاہدہ کو چاک کر دیا (ابن ہشام ص ۱۶۶۸، طبری ج ۳ ص ۱۱۸۹ سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۲۸ - ۲۲۹) یہ معاہدہ ختم ضرور ہو گیا مگر قریش کی ایذا رسانی جاری رہی، وہ آپ کی راہ میں کانٹے بچھاتے، آپ نماز پڑھتے تو ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپ کی گردن پر اوجھڑی لا کر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر زور سے کھینچتے کہ گردن مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں، آپ کو جادوگر اور مجنون کہتے، شریر لڑکوں کو آپ کے پیچھے کر دیتے، نماز با جماعت میں قرآن پڑھتے تو قرآن کے اتارنے والے خدا کو گالیاں دیتے، کہیں مجمع میں وعظ فرماتے تو ابولہب بدزبانی کرتا جاتا کہ یہ جھوٹ ہے، ان کے فریب میں نہ آنا، یہ لات و عزیٰ کی پرستش چھڑانا چاہتا ہے (صحیح بخاری ص ۹۸۶ و سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۳۶ - ۳۷)

مگر ان مزاحمتوں کے باوجود اسلام پھیلتا رہا جس سے پریشان ہو کر قریش دار الندوہ (دار الشوریٰ) میں جمع ہوئے اور یہ طے کیا کہ پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے آپ کا خاتمہ کر دے، اس صورت میں آپ کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا، آل ہاشم تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے، یہ فیصلہ کر کے جھٹ پٹے سے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ کا محاصرہ کر لیا، مگر اسی کے بعد ہجرت کا واقعہ پیش آگیا،

ان ایذا رسانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں:-

"دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں برغبت

سن لی گئی ہوں، حضرت نوح علیہ السلام کو سینکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور وحشت کا سامنا رہا، یونان دنیا کی شائستگی کا معلم اول ہے، تاہم اسی حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دار و رسن کا منظر پیش آیا، اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلۂ واقعات کی غیر معمولی کڑی نہ تھی، لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا؟ سقراط زہر کا پیالہ پی کر فنا ہو گیا، حضرت نوح علیہ السلام نے مخالفت سے تنگ آکر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دنیا کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیس چالیس شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بروایت نصاریٰ سولی پر چڑھ گئے، لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ان سب سے بالاتر تھا، خباب بن الارت نے جب قریش کی ایذا رسانی سے تنگ ہو کر آپ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے وہ لوگ گزر چکے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تھے، تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے، خدا اس کام کو پورا کرے گا، یہاں تک کہ شتر سوار صنعا سے حضر موت تک سفر کریگا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا، کیا یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری نہیں ہوئی۔" (سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۳۹ - ۲۳۸)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں سکونت پذیر ہوئے تو اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی، قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا، جنگ بدر اسی فیصلہ کا نتیجہ تھی جس میں اسلام کے دشمنوں کو شکست فاش ہوئی، مگر جب یہی دشمنان اسلام اسیران جنگ بنکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا، یہ قیدی دو دو چار چار

صحابہ کو تقسیم کردیے گئے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ وہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہ نے اس حکم کی تعمیل کی، وہ خود کھجور کھاکر رہ جاتے تھے، مگر ان کو پورا کھانا کھلاتے، ان قیدیوں میں ابوعزیز کا بیان ہے کہ انصار جب ان کا صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھالیتے، مجھکو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دیدیتا، لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے، اور مجھکو واپس دیدیتے، اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرتؐ نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے"۔ (طبری ص ۱۳۴۸، سیرۃ النبی جلد اول ص ۳[illegible])

جنگ بدر کی شکست کے بعد مشرکین قریش احد کے میدان میں پھر جمع ہوئے، اپنی ہزیمت کا انتقام لینے کی خاطر بہت ہی غضبناک ہوکر لڑے، وہ اپنے غیظ و غضب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تیروں کی بوچھار کرنے لگے، اس وقت ان کو برا کہنے کے بجائے آپ کی زبانِ مبارک سے صرف یہ نکلا

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ — اے خدا میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں۔

اور جب دشمنوں کا حملہ اور پھر تیز تر ہوگیا تو عبرت کے لہجہ میں آپ کی زبان مبارک سے یہ حسرتناک الفاظ نکلے کہ وہ قوم کیا فلاح پاسکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے، یہ آہ بھی خداوند تعالیٰ کو پسند نہ آئی، جس کے بعد یہ آیت اتری کہ

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْئٌ (آل عمران ۱۲۸) — تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں۔

قریش کی اسلام دشمنی برابر جاری رہی، احد کے بعد چھوٹی بڑی لڑائیاں برابر ہوتی رہیں، اور جب ۸ھ میں غزوۂ موتہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے تو انکے سامنے قریش کے وہ تمام سرکش سردار تھے، جنھوں نے آپ کی ایذا رسانی، قتل اور مسلمانوں کی خونریزی، غارتگری اور آبرو شکنی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، مکہ میں فاتحانہ داخل ہوتے ہوئے

آپ نے اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ جب تک کوئی شخص خود ان پر حملہ آور نہ ہو، وہ کسی پر تلوار نہ اٹھائیں، اور جو شخص حرم میں چلا جائیگا یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لیگا، اس کی جان اور آبرو محفوظ رہے گی، اس رواداری پر عمل بھی ہوا، اس موقع پر تمام مفاخرہ، سارے انتقامات اور خونبہائے قدیم آپ کے قدموں کے نیچے تھے، مگر آپ نے سب کو نظرانداز کرکے قریش کو اس طرح مخاطب فرمایا کہ جاہلیت کا غرور، نسب کا افتخار خدا نے مٹادیا، تمام انسان آدم کی نسل سے ہیں، اور آدم مٹی سے بنے ہوئے تھے، خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

اس موقع کی جو مرقع آرائی علامہ شبلی نے کی ہے، وہ ان کی نثر نگاری کے محاکات کی ایک روشن مثال ہے، ناظرین کو اس کے پڑھنے میں لطف بھی آئے گا اور پیغمبر اسلامؐ کی رواداری کی ایک اعلیٰ مثال بھی ان کے ذہن میں نقش ہوجائے گی،

"آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب کے پیش رو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلعم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکرِ قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت صلعم کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت صلعم کی ایڑیوں کو لہولہان کردیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آآکر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی آگ پر لٹاکر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے، رحمت عالمؐ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا تمکو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا [illegible] کرنے والا ہوں"۔ وہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے لیکن مزاج شناس تھے، پکار اٹھے کہ تو

شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے، ارشاد ہوا، تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو، کفارِ مکہ نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا، اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے، لیکن آپ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ اپنی مملوکات سے دست بردار ہو جائیں۔" (سیرۃ النبی جلد اول ص ۴۷۵)

کیا مذہبی رواداری کی اس سے بہتر مثال کسی اور مذہب کی تاریخ میں مل سکتی ہے؟

وحشی حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کے قاتل تھے، وہ فتح مکہ کے بعد بھاگ کر طائف چلے گئے، پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا، رسول اللہ صلعم نے ان کو مسلمان تو کر لیا لیکن یہ بھی فرمایا کہ میرے سامنے نہ آیا کرنا کہ تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے، (صحیح بخاری قتل حمزہ، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۶۲)

ابوسفیان کی بیوی ہندہ تھی، اس نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کر کے ان کے دل و جگر کے ٹکڑے کیے تھے، فتح مکہ کے روز نقاب پوش ہو کر رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مسلمان بنکر امان کی سند حاصل کر لی، رسول اللہؐ نے جب ہندہ کو پہچانا تو اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، ہندہ متاثر ہو کر بول اٹھی، یارسول اللہ آپ کے خیمہ سے مبغوض تر خیمہ کوئی میری نگاہ میں نہ تھا، لیکن آپ کے خیمہ سے زیادہ محبوب خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں۔" (صحیح بخاری ذکر ہند، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۶۲)

ابوجہل کے فرزند عکرمہ اسلام لانے سے پہلے آپ کے سخت دشمن تھے، فتح مکہ کے بعد وہ بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھیں، وہ یمن گئیں، ان کو مسلمان بنا کر آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئیں، ان کو دیکھ کر آپ فرطِ مسرت میں ان کی طرف بڑھے، اور فرمایا اے ہجرت کرنے والے سوار تمہارا آنا مبارک ہو (موطا امام مالک کتاب النکاح، سیرۃ النبی جلد دوم ۳۶۳)

ابوسفیان آپ کے شدید دشمن تھے، آپ کے خلاف جتنی لڑائیاں لڑی گئیں، ان میں سب

نمایاں حصہ ان ہی کا تھا، فتح مکہ کے بعد حضرت عباسؓ ان کو رسول اللہؐ کی خدمت میں لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو قتل کر دینا چاہا لیکن آپ نے منع فرمایا، رواداری اور فراخدلی کی یہ مثال پیش کی کہ ان کے گھر کو امن و امان کا حرم بنا دیا، اور فرمایا جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کا قصور معاف ہوگا (صحیح بخاری، فتح مکہ۔ سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۶۴)

ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے تھے، اس سے متاثر ہو کر ایک صحابی نے عرض کیا کہ ان دشمنوں کے حق میں بددعا فرمائیں، یہ سن کر آپ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا، (صحیح بخاری بعثت النبی، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۸) ~~ایک دوسرے موقع پر چند صحابیوں نے~~ دشمنوں کے لیے اسی قسم کی بات کہی ~~تو فرمایا "میں دنیا کے لیے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں،~~ (مشکوٰۃ اخلاق النبی بحوالہ ~~صحیح مسلم، سیرۃ النبی جلد دوم ص~~ ۳۷۸)

مکہ میں جن دنوں مسلمانوں پر مظالم ہو رہے تھے، تو سخت قحط پڑا، لوگ ہڈی اور مردار کھانے لگے، آپ کا شدید دشمن ابوسفیان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ محمد! تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے، خدا سے دعا کرو کہ یہ مصیبت جاتی رہے، آپ نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، اور اللہ تعالیٰ نے اس مصیبت کو دور کر دیا (صحیح بخاری تفسیر دخان ج ۲، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۹)

طائف میں جب اسلام کی دعوت پہنچی، تو وہاں کے لوگوں نے مبلغینِ اسلام پر بڑے مظالم ڈھائے، ان کو بکثرت ہلاک کیا، صحابہ نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا کہ ان کے حق میں بددعا کیجئے، آپ ہاتھ اٹھاتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ بددعا فرما رہے ہیں، لیکن آپ یہ فرما رہے تھے "خداوندا! ثقیف (اہل طائف) کو اسلام نصیب کر اور دوستانہ ان کو مدینہ لا، اور یہ دعا قبول ہو کر رہی (ابن سعد غزوۂ طائف، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۷۹)

اسی طرح آپ سے دوس کے قبیلہ کے لیے بددعا کرنے کو کہا گیا، تو آپ نے ان کے لیے یہ دعا،

فرمائی، "خداوندا! اس کو ہدایت کر اور ان کو لا (صحیح مسلم مناقب اوس، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۸۸)

عبد اللہ بن ابی اسلام کی تاریخ میں منافقوں کا سردار سمجھا جاتا ہے، وہ جنگِ بدر کے بعد بظاہر مسلمان ہو گیا تھا، مگر اس کی مفسدانہ کارروائیاں اسلام کے بدترین دشمنوں سے زیادہ بڑھی ہوئی تھیں، وہ قریش کے سرداروں سے خفیہ خط و کتابت کرتا، مسلمانوں کے مخفی رازوں کو ان کے دشمنوں تک پہنچایا کرتا، مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی دعوتیں دیتا رہا، غزوۂ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، مگر میدان جنگ میں آپؐ سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا، جس سے مسلمانوں کی قوت بہت کمزور ہو گئی، واقعۂ افک میں حضرت عائشہؓ پر الزام لگایا، لیکن جب وہ مرا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مغفرت کے لیے نماز پڑھنے کے لیے آگے بڑھے، حضرت عمرؓ نے اس منافق کی ساری باتیں یاد دلائیں تو آپؐ نے فرمایا "اگر مجھے اختیار دیا جاتا کہ ستر دفعہ میں نماز پڑھوں تو اس کی بخشش ہو سکتی ہے تو میں اس سے بھی زیادہ پڑھتا" (صحیح بخاری کتاب الجنائز، سیرۃ النبی جلد دوم ص ۳۸۱)، یہ بھی روایت ہے کہ جب وہ مرا تو اس احسان کے معاوضہ میں کہ اس نے حضرت عباسؓ کو اپنا کرتہ دیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص مبارک اس کو پہنا کر دفن کیا (بخاری، سیرۃ النبی ج ۲ ص ۳۷۰)

رسول اللہؐ اور یہود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں سے براہ راست واسطہ اُس وقت پڑا جب آپؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے، جہاں یہودی اپنی دولت اور ثروت کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتے تھے، ان کا تمول انکے لین دین کے کاروبار کی وجہ سے تھا، انکے یہاں سود لینا جائز تھا، وہ اس کی شرحیں بے رحمی سے مقرر کرتے اور اس کے وصول کرنے میں بڑی سفاکی دکھاتے، لوگوں کی جائداد پر قبضہ کر لیتے، حتیٰ کہ انکے بچوں اور عورتوں کو اپنے یہاں رہن رکھ لیتے، دولت کی فراوانی کی وجہ سے اُن میں ہر قسم کی عیاشانہ برائیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں، عام طور سے وہ نفرت کی نظروں سے

دیکھے جاتے، مگر لوگ ان کے قرض سے دبے رہتے تھے، اس لیے ان کا اقتدار قائم رہتا، عرب کے قبیلے آپس میں لڑا کرتے تو یہ ان کے اختلاف کو کسی نہ کسی صورت سے بڑھاتے رہتے، اسلام پھیلنے لگا تو یہودیت کا زور ختم ہونے لگا، مسلمان ان کی بداخلاقی کو بری نظر سے دیکھنے لگے، صدیوں سے ان کا جو وقار قائم تھا، وہ ضائع ہونے لگا، قرآن مجید ان کے ذمائم کی علیحدہ پردہ دری کر رہا تھا، پھر بھی مدینہ کے اطراف میں یہودیوں کے تین قبیلوں بنو قینقاع، بنو نضیر اور قریظہ کا بڑا اثر رہا، انھوں نے اپنے لیے بڑے بڑے قلعے بنا لیے تھے، اور مدینہ کے دو قبیلے اوس اور خزرج کو اپنی فتنہ انگیزیوں سے لڑایا کرتے تھے، جس سے یہ قبیلے پریشان رہتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کی شرانگیزیوں اور بدباطنی سے واقفیت رکھنے کے باوجود ان کے اور مسلمانوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش فرمائی، مدینہ کے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک معاہدہ لکھوایا جس کے شرائط یہ قرار پائے:- (۱) خونبہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا، اب بھی قائم رہے گا (۲) یہود کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہو گی (۳) یہود اور مسلمان آپس میں دوستانہ تعلقات رکھیں گے (۴) فریقین سے جب کسی تیسرے فریق سے جنگ ہو گی تو وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے (۵) کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا (۶) کوئی بیرونی طاقت مدینہ پر حملہ کرے گی تو دونوں مل کر مداخلت کریں گے (۷) کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کریگا تو دوسرا بھی شریکِ صلح ہو گا، البتہ مذہبی لڑائیاں اس سے مستثنیٰ رہیں گی (ابن ہشام ج ۱ ص ۲۷۹، ۲۷۸، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۷۵)

یہ معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذہبی رواداری اور فراخدلی کی ایک ایسی مثال ہے جس پر دنیا ناز کر سکتی ہے، موجودہ دور کی اقوام متحدہ بھی فریقین میں اس سے بہتر معاہدہ نہیں کرا سکتی، مگر اس رواداری کے باوجود یہودی نچنت نہیں بیٹھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کے بجائے مکہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنانے کا اعلان کیا تو یہودیوں کو بڑا دکھ پہنچا،

اور انھوں نے معاہدہ کے باوجود مسلمانوں کی علانیہ مخالفت شروع کردی، وہ مدینہ کے ان لوگوں سے ساز باز کرنے لگے جو ابھی تک بت پرست تھے، یا مسلمان بننے کے باوجود منافقانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھے، جب مدینہ پر قریش نے حملہ کیا تو وہ خوش تھے لیکن جب مکہ کے مشرکین کو بدر کے میدان میں شکست ہوئی تو ان کو بڑا دکھ پہنچا، انھوں نے اسلام کی بیخ کنی کو اپنا شعار بنالیا، بنی قینقاع بڑے طاقتور یہودی تھے، ان میں سے ایک یہودی نے ایک انصاریہ عورت کی بے حرمتی کی تو ایک انصاری نے غیرت اور غصہ میں آکر اس یہودی کو قتل کردیا، یہودیوں نے مل کر اس انصاری کو قتل کردیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ ان یہودیوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا خدا سے ڈرو، ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب نازل ہو جائے، انھوں نے جواب دیا کہ ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑیگا تو ہم دکھادینگے کہ لڑائی کس کا نام ہے، یہ نقضِ امن ایک طرح کا اعلانِ جنگ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انکی ریشہ دوانیوں سے عاجز آچکے تھے، اسلیے مجبور ہو کر انکے خلاف جنگ کی، وہ قلعہ بند ہوگئے، پندرہ (۱۵) دن کے محاصرہ کے بعد انھوں نے اپنی شکست تسلیم کرلی، اور اس پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ جو فیصلہ کرینگے ان کو منظور ہوگا، آپ نے ان سے انتقام لینے کے بجائے شام کے علاقہ اذرعات میں جلاوطن کردینے پر اکتفا کیا، (سیرت ابن ہشام و ابن سعد غزوۂ بنی قینقاع، سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۷۱)

یہودیوں کے ایک با اثر سردار کعب بن اشرف نے جنگ بدر کے بعد مکہ جاکر قریش کی تعزیت کی اور ان کی حمایت میں نہایت پرزور مرثیہ لکھ کر ان کو انتقام کے لیے ابھارا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو لکھی اور ابوسفیان سے خانہ کعبہ میں لیجاکر انتقام کا حلف اٹھوایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی، ان فتنہ انگیزیوں سے وہ خود قتل کیا گیا، (سیرت ابن ہشام حالات غزوۂ بدر، بخاری، سیرۃ النبی جلد اول ص، تاریخ اسلام اول از شاہ معین الدین احمد ندوی ج ۱ ص ۵۲)

(باقی)

یہود اور قرآن مجید

از ضیاء الدین اصلاحی

(۴)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے انحراف یہود کے اخلاقی انحطاط کا اصل سبب یہ تھا کہ ان میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا رواج ختم ہوگیا تھا، برائیوں کی روک تھام نہ کرنے کی وجہ سے ساری قوم کا اخلاقی مزاج بگڑ گیا تھا، ان کا اجتماعی ضمیر مردہ اور ایمانی و اخلاقی غیرت فنا ہوگئی تھی، بنی اسرائیل کے بارہ (۱۲) قبیلے تھے ہر ہر قبیلہ کی نگہداشت کے لیے ایک ایک نقیب مقرر کیا گیا تھا، مگر آہستہ آہستہ وہ احتساب کے فرض سے غافل ہوتے گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم برائیوں میں مبتلا ہوگئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کا اس طرح اظہار فرمایا ہے:۔

"بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اس طرح شروع ہوا کہ جب برائی پھیلنے لگی تو پہلے انکے علماء نے منع کیا لیکن جب وہ باز نہ آئے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے لگے تو صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہوگئے"[1]

اصحاب سبت کے واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ابتداءً ان کے اندر برائیوں سے روکنے والا ایک گروہ موجود تھا، چنانچہ جب ایک جماعت حیلہ کرکے سبت (سنیچر) کے روز مچھلیاں پکڑنے لگی تو دوسری جماعت نے اس کو اس فعل سے روکا، ان دونوں کے علاوہ ایک

---

[1] جامع ترمذی باب تفسیر سورۂ مائدہ۔

تیسری جماعت بھی تھی جو اگرچہ اس معصیت میں خود تو شریک نہ تھی مگر وہ پہلی جماعت کو ارتکاب جرم سے منع نہ کرتی تھی اور دوسری جماعت سے یہ کہتی تھی کہ ان لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جو باز آنے والے نہیں اور جن کی ہلاکت یقینی ہے، بالآخر جب عذاب الٰہی آیا تو صرف برائی سے روکنے والا گروہ اس سے محفوظ رہا، باقی دونوں جماعتیں ہلاک ہوگئیں، ایک تو ارتکاب جرم کی پاداش میں اور دوسری امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ترک کے باعث[1]،

پھر وہ وقت آگیا جب علانیہ گناہوں کا ارتکاب ہونے لگا اور نیکی بدی کا احساس مٹ گیا، قرآن نے اسی بنا پر کہا ہے :۔

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ	بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا ان پر
اِسْرَآئِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ	داؤد اور عیسٰی بن مریم کی زبان سے لعنت ہوئی،
وَعِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا	یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور
عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ، کَانُوْا	حد سے زیادہ آگے بڑھ جایا کرتے تھے، جس
لَا یَتَنَاہَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ	برائی کو اختیار کیے ہوئے تھے اس سے منع نہ کرتے
لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (مائدہ : ۷۸، ۷۹)	بہت ہی بری بات تھی جو یہ کرتے تھے۔

یہ فریضۂ اصلاح ان کے علماء، و ارباب حل وعقد پر عائد کیا گیا تھا لیکن وہ اپنے فریضۂ منصبی سے بالکل غافل ہوگئے تھے، چونکہ انھوں نے اپنے آپ کو شریعت کی پابندیوں سے آزاد کر لیا تھا، اسلیے ان میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ دوسروں کو ہدایت کرسکیں، انکی ڈھٹائی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بے عملی کے باوجود لوگوں کو پرہیزگاری، نیک عملی اور خدا کی اطاعت کی تلقین کرتے تھے، قرآن کریم نے اس روش پر ان کو یوں ملامت کی ہے :۔

---

[1] اعراف : ۱۶۳ تا ۱۶۵

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ	کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور
اَنْفُسَکُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ	اپنے آپ کو بھول جاتے ہو درانحالیکہ
(بقرہ : ۴۴)	تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔

حضرت مسیحؑ نے بھی فرمایا ہے :۔

"اے شرع کے عالمو! تم پر افسوس ہے کہ تم ایسے بوجھ جنکا اٹھانا مشکل ہے، آدمیوں پر لادتے ہو اور آپ ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے۔" (لوقا ۱۱ : ۴۷)

وہ حق سے خود منحرف اور دوسروں کی اصلاح کی فکر سے تو غافل تھے ہی، اس پر طرہ یہ کہ انکی ساری قابلیت لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے اور دین سے برگشتہ کرنے پر صرف ہوتی تھی، ہادی و مرشد کے بجائے وہ رہزن بن گئے تھے، جھوٹے فتوے دیکر لوگوں کو گمراہ کرتے اور جب اصلاح کی کوشش کیجاتی تو یہ اپنی عالمانہ فریب کاری سے سنگِ راہ بنجاتے، اسی لیے قرآن مجید نے انکے علماء پر "صد عن سبیل اللہ" کا الزام عائد کیا ہے :۔

وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	(یہودی علماء وفقہاء لوگوں کو) اللہ کی راہ
(توبہ : ۳۴)	سے روکتے ہیں۔

اور دوسری جگہ خدا نے ان سے اپنی نعمتیں چھین لینے کی وجہ یہ بیان کی ہے :۔

وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	اور اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی راہ
کَثِیْرًا (نساء : ۱۶۰)	سے بہت روکتے ہیں۔

جھوٹ بنی اسرائیل میں جھوٹ کا اس قدر زور تھا کہ قرآن مجید کو کہنا پڑا :۔

وَمِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا سَمّٰعُوْنَ	اور ان لوگوں میں سے جنھوں نے یہودیت
لِلْکَذِبِ (مائدہ : ۴۱)	اختیار کی جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صداقت و راستبازی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں رہ گیا تھا، انھوں نے جھوٹ کو اپنا شعار بنالیا تھا، جھوٹی گواہی، جھوٹا بیان اور جھوٹا اشتہار ان کا معمول ہو گیا تھا، اور اپنی اس دروغ بیانی پر ندامت کے بجائے بے تحاشا قسمیں کھاکر جھوٹ کو سچ ثابت کرتے، یہود کے عوام ہی نہیں، ان کے علماء بھی اس میں ملوث تھے، قرآن نے ان کو تنبیہ کی کہ "تم لوگوں کو جھوٹی اور غلط باتیں کہنے سے کیوں نہیں روکتے"[1] توراۃ میں بھی ان کو اس قبیح عادت سے منع کیا گیا تھا:

"جھوٹا معاملہ نہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو، تم میرا نام لیکر جھوٹی قسمیں نہ کھاؤ، تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔" (خروج ۲۰: ۱۶)

زنا اور بدکاری

یہود کے احکام عشرہ کی ایک دفعہ یہ تھی "اور تو زنا مت کر۔" (خروج ۲۰: ۱۵) لیکن یہ حکم بھی انھوں نے پس پشت ڈالدیا تھا، میاں بیوی کے درمیان تفریق ڈالنا انکا محبوب مشغلہ تھا[2] یہ مذموم حرکت وہ اس لیے کرتے تھے تاکہ دوسرے کی بیوی کو اس سے جدا کرکے اپنی طرف مائل کرلیں،

قرآن سے قطع نظر خود توراۃ ان کی بدکاری اور فحش پسندی کے واقعات سے پُر ہے قریۂ اریحا کی فتح کے سلسلہ میں توراۃ نے ان کی یہ حالت بیان کی ہے کہ

"بنی اسرائیل نے یہ شہر حضرت موسیٰؑ کے اخیر زمانے میں فتح کیا اور وہاں بڑی بدکاریاں کیں، جن کے نتیجہ میں خدا نے ان پر وبا بھیجی اور چوبیس ۲۴ ہزار آدمی ہلاک کر دیے گئے۔" (گنتی ۲۵: ۱-۸)

توراۃ کے باب سلاطین میں ان کی متعدد شرارتوں اور نافرمانیوں کے ضمن میں بھی اسکا ذکر ہے کہ

"اور اپنے تئیں بیچ ڈالا کہ خداوند کے حضور بدکاریاں کریں کہ اسے غصہ دلادیں، ان باتوں سے خداوند بنی اسرائیل پر سخت غصہ ہوا۔" (سلاطین ۱۷ : ۱۸)

---

[1] مائدہ : ۶۳ [2] بقرہ : ۱۰۲

حضرت داؤدؑ کی مناجات میں ہے:-

"اور (تو) زانیوں کا شریک رہا ہے، تیرے منہ سے بدی نکلتی ہے اور تیری زبان فریب گھڑتی ہے، تو بیٹھا بیٹھا اپنے بھائی کی غیبت کرتا ہے اور اپنی ماں کے بیٹے پر تہمت لگاتا ہے۔" (زبور ۵۰ : ۱۶ - ۲۲)

تورات کے ابواب احبار و استثنا میں زنا کی سزا رجم بیان ہوئی ہے، مگر جب یہود میں زنا اور فواحش کی کثرت ہوئی تو ان کو رجم کی سزا دینے میں پس و پیش ہوا اور وہ طرح طرح کے حیلے بہانے کرنے لگے، حیلہ جوئی کی خاطر یہ لوگ بعض مقدمات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی پیش کرتے، تاکہ وہ اپنی شریعت کے سخت قانون کی گرفت سے بچ جائیں، تفسیر کی کتابوں میں سورہ مائدہ کی آیت [وکیف یحکمونک الخ] کے ضمن میں یہود کے اسی طرح کے ایک مقدمہ کا ذکر ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ خیبر کے کسی معزز یہودی خاندان کی ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق ہوگیا، توراۃ کے قانون کے مطابق ان کی سزا رجم تھی، لیکن وہ ان کو سنگسار نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لیے رسول اللہ صلعم کے پاس اس غرض سے آئے کہ اگر آپ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کر لیا جائے لیکن اگر رجم ہی کا حکم دیں تو اسے قبول نہ کیا جائے، چنانچہ جب آپ نے رجم کا حکم دیا تو انھوں نے اس کو ماننے سے انکار کردیا، آپ نے پوچھا تمھارے مذہب میں اس کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے کہا کوڑے مارنا اور منہ کالا کرکے گدھے پر سوار کرنا، آپ نے ان کے علماء سے قسم دے کر پوچھا مگر انھوں نے بھی یہی جھوٹی بات کہی، اس موقع پر ایک شخص جس کو وہ تورات کا سب سے بڑا عالم سمجھتے تھے، خاموش رہا، آپ نے اس سے فرمایا، میں تجھ سے خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی توراۃ میں زنا کی یہی سزا ہے؟ اس نے بتایا کہ اس کی سزا تو رجم ہی ہے؛ مگر ہمارے یہاں جب زنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حکام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو

انھیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو انھیں رجم کیا جاتا، مگر جب عوام میں اس سے ناراضگی پیدا ہونے لگی تو ہم نے توراۃ کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنالیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور ان کا منہ کالا کرکے گدھے پر الٹے منہ سوار کیا جائے" (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۸-۵۹)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہود میں یہ برائی کتنی عام ہوگئی تھی، اور انھوں نے اس کی سزا میں تخفیف کرکے اس کے مزید فروغ کا کیسا سامان کردیا تھا۔

حب دنیا پہلے جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہود کی ساری تگ و دو اور ہر قسم کی سرگرمیاں صرف حصولِ دنیا کے لیے وقف ہو گئی تھیں۔ وہ اس کے پیچھے ایسے دیوانے ہو گئے تھے کہ انکی نگاہ میں آخرت کی کوئی قدر وقیمت باقی نہ رہ گئی تھی،

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ (بقرہ: ۸۶)
یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت بیچ کر دنیا کی زندگی خرید لی ہے۔

اسی لیے ان کو موت سے سخت وحشت اور گھبراہٹ ہوتی تھی، حالانکہ وہ خدا کے محبوب و مقرب ہونے کے مدعی تھے اور اپنے آپ کو آخرت کی نعمتوں کا تنہا حقدار سمجھتے تھے، اس کا لازمی تقاضا تو یہ تھا کہ وہ دنیا پر ریجھنے کے بجائے اس سے وحشت زدہ اور موت سے لرزہ براندام رہنے کے بجائے اس کے آرزومند ہوتے،

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (جمعہ: ۵)
کہو کہ اے وہ لوگو! جنھوں نے یہودیت اختیار کی ہے اگر تم کو یہ گمان ہے کہ تم ہی لوگوں کے مقابلہ میں اللہ کے دوست ہو تو موت کی آرزو کرو اگر تم لوگ (اپنے دعوے میں) سچے ہو۔

مگر اس کے برعکس قرآن مجید نے ان کا حال یہ بیان کیا ہے کہ

وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ (جمعہ: ۷)
اپنے اعمال کی وجہ سے یہ لوگ کبھی موت کی آرزو نہ کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

یہی مضمون دوسری جگہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:-

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰي حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (بقرہ: ۹۶)
اور تم ان لوگوں (یہود) کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے یہاں تک کہ ان لوگوں سے بھی زیادہ جنھوں نے شرک کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اس کو ہزار سال کی عمر ملے، حالانکہ اگر یہ عمر بھی ملے تو بھی وہ اپنے کو عذاب سے بچا نہیں سکتے اور اللہ دیکھ رہا ہے

قرآن نے ان کی بزدلی اور جہاد فی سبیل اللہ سے فرار کے جو واقعات بیان کیے ہیں ان سے بھی ان کی یہی مکروہ تصویر سامنے آتی ہے، ان کے آیاتِ الٰہی کو ذریعۂ تجارت بنا لینے، دنیا کے چند سکوں کی خاطر اللہ کے عہد کو توڑنے، حق کو چھپانے اور کتاب الٰہی کی تحریف اور اسکے اندر اپنے طبع زاد فتوے شامل کردینے کا مفصل ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کو ان معصیتوں میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوتی، اگر کبھی اس زر پرستی اور حبِ دنیا پر ان کا ضمیر ملامت کرتا تو جھوٹے سہاروں اور موہوم تمناؤں سے اپنے کو اس طرح تسکین دے لیتے کہ ہم خدا کے محبوب ہیں، ہماری ساری غلطیاں معاف ہیں، قرآن نے ان کی اسی ذہنیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:-

وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا (اعراف: ۱۶۹)
اور کہتے ہیں ہمارے لیے سب معاف کر دیا جائیگا۔

وہ مال ہی کو عزت و برتری کا معیار سمجھتے تھے، قیادت و سرداری کو تعداد اور مال کے پیمانے سے ناپتے تھے، چنانچہ جب حضرت سموئیل ؑ نے ان کے مطالبہ پر طالوت کو انکا سردار مقرر کیا تو وہ اس پر خوش ہونے کے بجائے الٹے خدا کے انتخاب پر اعتراض کرنے لگے اور کہنے لگے

أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا	بھلا اس کی امارت ہمارے اوپر کیسے
وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ	ہوسکتی ہے جبکہ اس سے زیادہ حق دار
وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ	ہم اس امارت کے ہیں اور اسے تو مال
(البقرہ : ۲۴۷)	کی فراوانی بھی حاصل نہیں ہے۔

توراۃ میں ہے :-

"اور ساؤل (طالوت) بھی .... اپنے گھر گیا اور لوگوں کا ایک جتھا جن کے دلوں کو خدا نے مائل کر دیا تھا، اس کے ساتھ ہو لیا، پر بنی بلعال بولے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا اور اس کی تحقیر کی اور اس کے لیے نذرانے نہ لائے، پر اس نے اپنے آپ کو ایسا بنایا گویا نہ سنتا تھا۔" (سموئیل ۱۰ : ۲۶-۲۷)

توراۃ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ذہنیت سے واقف ہونے کی بنا پر طالوت کو خود بھی اندازہ تھا کہ چونکہ ان کو مالی و خاندانی وجاہت حاصل نہیں ہے اسلیے بنی اسرائیل کو ان کی قیادت منظور نہ ہوگی۔ (سموئیل ۱۹ : ۲۱)

دنیا کے پیچھے اس طرح دیوانگی کی وجہ سے یہود میں جو بڑی بڑی خرابیاں اور اخلاقی پستیاں پیدا ہوئیں ان میں سے بعض کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے :-

خیانت عموماً خیانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اشیا تک محدود سمجھا جاتا ہے، مگر درحقیقت اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور یہود ہر قسم کی خیانت اور بددیانتی میں مبتلا تھے، انھوں نے سب سے بڑی خیانت تو خود اللہ تعالیٰ اور اس کی شریعت میں کی تھی، اسی

بنا پر حضرت مسیح ؑ نے ان کو اس فاحشہ عورت سے تشبیہ دی تھی جو اپنے شوہر سے غداری اور بیوفائی کرتی ہے، قرآن نے چند لفظوں میں ان کی خیانت اور بدعہدی کی پوری تصویر کھینچی ہے :

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ	تم برابر ان کی خیانت سے مطلع
مِّنْهُمْ (مائدہ : ۱۳)	ہوتے رہوگے۔

ان کی بددیانتی کا یہ حال تھا کہ :-

وَمِنْهُم مَّنْ إِن تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ	اور ان میں ایسے لوگ ہیں کہ اگر تم انکے پاس
لَّا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ	ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک
عَلَيْهِ قَائِمًا ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ	اسکو ادا نہ کرینگے جب تک کہ تم ان کے سر پر
قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ	سوار نہ ہو جاؤ، یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے
سَبِيلٌ (آل عمران : ۷۵)	ہیں کہ امیوں (عربوں) کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ اور الزام نہیں ہے۔

اپنی قوم کا تو کچھ پاس کرتے تھے مگر دوسروں کے معاملہ میں کسی اخلاقی ضابطہ کے پابند نہ تھے، ان کے نزدیک غیر یہودی کا مال ہڑپ کر لینا معیوب نہ تھا، وہ ان کی امانتوں میں خیانت کرتے اور ان کے مال میں دستبرد کو کار ثواب خیال کرتے تھے، توراۃ میں غصب، سود اور خیانت کی جو ممانعت کی گئی ہے، اس کے بارہ میں یہ سمجھتے تھے کہ اس کا تعلق غیر قوموں اور کافروں سے نہیں ہے، اس من گھڑت ضابطہ نے دوسری قوموں سے خیانت اور بدمعاملگی کرنے میں انھیں بہت دلیر بنا دیا تھا، دراصل اسرائیلی و غیر اسرائیلی کی تفریق ان کی مذہبی روایات میں قدم قدم پر ملتی ہے، مثلاً "جو قرض ایک شخص نے دوسرے کو دیا وہ سات سال گذر جانے پر ضرور معاف کر دیا جائے مگر پردیسی سے تو اس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔" (استثنا ۱۵ : ۱-۳)

توراۃ میں غیر اسرائیلیوں کے لیے پردیسی اور اجنبی کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے،

سود خواری

سود خواری کا بھی یہودیوں میں عام رواج تھا، وہ بعثت نبوی سے پہلے ہی
سے حجاز میں آباد تھے، جب یونانیوں اور سریانیوں نے ان کو اپنے علاقے سے نکالا تو یہ عرب
چلے آئے اور ان جگہوں میں آباد ہوئے جہاں چشمے اور سرسبز مقامات تھے، پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑ توڑ
اور سودی کاروبار کے ذریعہ ان پر قابض ہو گئے۔ اس طرح خیبر، مدینہ اور اس کے اطراف میں
انھوں نے نہایت مضبوط قلعے تعمیر کر لیے تھے[1]، عربوں کے مقابلہ میں ان کو معاشی بالادستی
بھی حاصل تھی، یثرب (مدینہ) پر یہ اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ وہاں کے دو مشہور قبائل اوس
و خزرج کو برابر لڑاتے رہتے اور متحد نہ ہونے دیتے، یہودی چونکہ فلسطین و شام جیسے متمدن
علاقوں سے آئے تھے اس لیے عربوں کے مقابلہ میں وہ زیادہ ترقی یافتہ تھے، ان کے دوسرے
ملکوں سے کاروباری تعلقات بھی تھے، اس طرح یثرب و حجاز میں غلے کی برآمد اور دوسرے
وسائلِ معیشت پر ان کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا، اس کثیر المنفعت تجارت کے علاوہ سودی کاروبار
بھی خوب پھیلا ہوا تھا، غریب، کسان اور مزدور ان سے بھاری شرح سود پر قرضے لیکر
سود در سود کے جال میں پھنسے ہوئے تھے،

قرآن مجید نے یہود کے غضبِ الٰہی کے مورد ہونے اور ان سے خدا کی نعمتوں کے چھینے
جانے کا ایک سبب یہ بھی بتایا ہے کہ

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا — اور اس وجہ سے کہ وہ سود لیتے ہیں حالانکہ
عَنْهُ (النساء - ۱۶۱) — اس سے ان کو روکا گیا ہے۔

یہاں قرآن نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ توراۃ کی ممانعت کے باوجود یہ قوم سود
خواری کی لعنت میں گرفتار رہی، اس کی توثیق توراۃ کی اس عبارت سے ہوتی ہے،

۱؎ الملل والنحل شہرستانی ج ۲ ص ۴۹

"اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دے تو اس سے
بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر اور اس سے سود مت لے، اگر تو کسی وقت اپنے
ہمسایے کے کپڑے گرو میں رکھ لے تو چاہئے کہ سورج ڈوبتے ہوئے اسے پہنچا دے،
کیونکہ یہ اس کا فقط اوڑھنا ہے، یہ اس کے بدن کے لیے لباس ہے جس میں وہ سوتا
ہے اور یوں ہوگا کہ جب وہ میرے آگے فریاد کرے گا میں اس کو سنوں گا، کیونکہ
میں مہربان ہوں" (خروج ۲۲ : ۲۵ - ۲۷)

"اور اگر تمھارا بھائی تمھارے بیچ محتاج اور تہی دست ہو جائے تو تم اس کی
دستگیری کرو، خواہ وہ اجنبی ہو خواہ مسافر تاکہ وہ تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے،
تو اس سے سود اور نفع مت لے پر اپنے خدا سے ڈر تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی
بسر کرے، تو اسے سود پر روپیہ قرض مت دے نہ اسے نفع کے لیے کھانا کھلا" (احبار ۲۵ : ۳۵ - ۳۸)

لیکن توراۃ کی ان صاف ہدایات کے باوجود ان کی سود خواری میں کوئی فرق نہ آیا اور
تاریخ کے ہر دور میں ان کے حرص و سنگدلی کا یہی رنگ رہا، دوسری قومیں تو خاص طور سے انکے
ظلم و استحصال کا نشانہ رہیں، اس بارہ میں انھوں نے اپنی کتاب میں تحریف کر دی اور غیر قوموں سے
سود لینے کو بالکل جائز کر لیا، ملاحظہ ہو:-

"تو پردیسی کو سود پر قرض دے تو دے پر اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا" (استثنا ۲۳ : ۲۰)

رشوت

رشوت خوری کا بھی ان کے یہاں ایسا زور تھا کہ قرآن مجید کو کہنا پڑا

اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ : ۴۲) — (یہود) پکے رشوت خور ہیں

دوسری جگہ فرمایا؛

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ — اور تم ان (اہل کتاب) میں سے اکثر کو دیکھو گے

فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَکْلِهِمُ	کہ وہ گناہ، زیادتی اور رشوت کھانے
السُّحْتَ (مائدہ: ۶۲)	میں گرم رو ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اخلاقی بیماری وبا کی طرح ان کے اندر پھوٹ پڑی تھی اور ان کی سرشت میں داخل ہو گئی تھی، اس بارہ میں ان کے علماء اور بھی آگے تھے، وہ رشوتیں لیکر خدا کے قوانین تک کو مسخ کر دیتے اور عوام کو حسبِ خواہش غلط احکام بتاتے تھے، اسی لیے قرآن نے ان کو سرزنش کرتے ہوئے کہا ہے :۔

لَوْلَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ	ان کے علما و فقہا ان کو گناہ کی بات
الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَکْلِهِمُ	کہنے اور رشوت کھانے سے روکتے
السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ	کیوں نہیں، کتنی بری حرکت یہ
(مائدہ: ۶۳)	کر رہے ہیں۔

جب کسی قوم کے اندر اس طرح رشوت کی گرم بازاری ہو جائے تو اس کے یہاں عدل و انصاف باقی نہیں رہ سکتا، یہی وجہ ہے کہ یہود کی عدالتیں بے جان اور بے اعتبار ہو گئی تھیں، لوگ حکام کو کچھ دے کر اور گواہوں کو خوش کر کے اپنے موافق فیصلے کرا لیتے، حالانکہ توراۃ میں ہدایت کی گئی تھی :۔

"اپنے سارے فرقوں میں قاضی و حاکم مقرر کیجیو، وہ انصاف سے لوگوں کی عدالت کریں تو عدالت میں مقدمہ نہ بگاڑیو، طرفداری نہ کیجیو اور نہ رشوت لیجیو، رشوت دانش مند کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے اور صادق کی باتوں کو پھیرتی ہے۔" (استثناء ۱۸: ۱۹)

یہی نہیں بلکہ ان کو ہدیہ اور نذرانہ لینے سے بھی منع کیا گیا تھا،

"تو ہدیہ نہ لینا کیونکہ ہدیہ دانش مندوں کو اندھا کر دیتا ہے اور صادقوں کی باتوں کو پھیر دیتا ہے"

(خروج ۲۳: ۸)

غیر یہودیوں کے ساتھ تو حلال و حرام کی قید ہی انھوں نے ختم کر دی تھی، اس لیے ان سے رشوت لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، ان کے مذہبی صحیفہ تالمود میں ہے :۔

"جب کسی مقدمہ میں ایک فریق اسرائیلی ہو اور دوسرا غیر اسرائیلی تو اگر اسرائیلی کے موافق فیصلہ یہودی شریعت کے مطابق ہو سکتا ہے تو وہی فیصلہ کرو اور کہہ دو کہ یہی ہمارا قانون ہے، اور اس کے موافق غیر اسرائیلی قانون کے مطابق ہو سکتا ہو تو یہی کر دو اور غیر اسرائیلی سے یہ کہہ دو کہ تمھارے یہاں کا ضابطہ یہی ہے اور اگر ایسا فیصلہ دونوں ضابطوں میں سے کسی ضابطہ سے بھی نہ ہو رہا ہو تو کسی حیلہ سے کام لو۔"

اکل اموال بالباطل قرآن نے یہود و نصاریٰ کی ان تمام حرکات کو ایک لفظ اکل اموال بالباطل میں سمیٹ لیا ہے، سورہ توبہ میں ان کے علماء و مشائخ کا یہ کردار بیان ہوا ہے :۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا	اے ایمان والو! بیشک اکثر (یہودی)
مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ	علما اور (مسیحی) راہب لوگوں کا مال باطل
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ	طریقوں سے کھاتے ہیں۔
(توبہ: ۳۴)	

اکل اموال بالباطل بڑا جامع لفظ ہے، اس کے اندر جو مال بھی جھوٹ، فریب، غصب، خیانت، رشوت، چوری، جوے، سود بٹہ وغیرہ ناجائز ذرائع سے حاصل کیا جائے سب شامل ہے، اسی طرح لین دین اور تجارت کے وہ سب طریقے بھی اس کے اندر داخل ہیں جن میں معاملت کے دونوں فریقوں کی رضا اور مفاد کا خیال نہ کیا جائے بلکہ ایک فریق کا فائدہ ملحوظ رکھا گیا ہو اور دوسرے کو نقصان کا نشانہ بنایا گیا ہو، اسی طرح علمائے یہود صدقات و زکوٰۃ کی رقموں کو فقرا و مساکین میں تقسیم کرنے کے بجائے خود اپنے قبضہ و تصرف میں لے لیتے تھے، یہ بھی اکل اموال بالباطل تھا،[1]

[1] علمائے تفسیر نے اکل اموال بالباطل کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں، مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے اس پر جو کچھ لکھا ہے وہ بہت خوب ہے۔ (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۱۲۶ و ۱۲۷ (مدینہ پریس بجنور)

یہ جب ان کے خواص اور علماء کا حال تھا جن کو مخاطب کر کے حضرت مسیحؑ نے ایک بار فرمایا تھا:

"تم نے میرے باپ (رب) کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا دیا، تم اوروں کو توڑیے اور سونف پر بھی عشر کا حساب بتاتے ہو لیکن دوسروں کا مال ہڑپ کر جاتے ہو"

تو عوام کا کیا حال رہا ہوگا، قرآن نے ان کے بھی اس میں ملوث ہونے کا ذکر کیا ہے۔[1]

ہراس اور بزدلی مال وزر کی طمع اور طویل زندگی کی آرزو نے ان کو اتنا بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا کہ وہ اپنے دشمنوں سے جہاد اور خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے ہمیشہ پہلوتہی کرتے تھے، وہ ارض مقدس کی بازیافت کے آرزومند تھے مگر حضرت موسیٰؑ کی یقین دہانیوں اور یوشع وکالب کی ولولہ انگیز تقریروں کے باوجود ان کی بے ہمتی کا وہی عالم رہا، قرآن مجید نے انکی بزدلی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ گذشتہ اوراق میں نقل ہو چکا ہے[2]، اب توراۃ کا بیان بھی ملاحظہ ہو:۔

"ہمیں زور نہیں کہ ہم ان لوگوں پر چڑھیں، کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زورآور ہیں، یہ زمین جس کی جاسوسی میں ہم گئے تھے، ایک زمین ہے جو اپنے بسنے والوں کو نگلتی ہے، اور سب لوگ جنھیں ہم نے وہاں دیکھا بڑے قدآور ہیں اور ہم نے وہاں جباروں کو یعنی بنی عناق کو جو جباروں کی نسل میں ہیں دیکھا اور ہم اپنی نظروں میں انکے سامنے ایسے تھے جیسے ٹڈے اور ایسے ہی ہم انکی نظروں میں تھے۔" (گنتی ۱۳: ۳۲۔۳۳)

"تب ساری جماعت چلا کر روئی اور لوگ اس رات بھر روا کیے، پھر سارے بنی اسرائیل موسیٰ وہارون پر کڑکڑائے اور ساری جماعت نے انھیں کہا کہ اے کاش ہم مصر میں مرجاتے اور کاش کہ ہم اسی بیابان میں فنا ہوتے، خداوند کس لیے ہم کو اس زمین میں لایا کہ تلوار سے گر جائیں اور ہماری جورواں اور بچے پکڑے جائیں۔" (گنتی ۱۴: ۱۔۳)

---

[1] نساء ۴۱ [2] مائدہ ۲۱۔۲۴

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوشع وکالب پر وہ اس قدر برہم ہوئے کہ ان پر پتھراؤ بھی کرنا چاہا تھا۔

ان کے اندر شجاعت و دلیری اور خودداری و عزت نفس کا جوہر ہی باقی نہ رہ گیا تھا، اس لیے ہر قسم کی رسوائیاں برداشت کرتے مگر ہمت و غیرت سے کام نہ لیتے اور عزت کی موت پر ذلت کی زندگی کو ترجیح دیتے، قرآن کریم نے ان کی تاریخ کے ایک ایسے ہی واقعہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ (بقرہ: ۲۴۳)	کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سموئیلؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل تین لاکھ کی تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے دشمنوں سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ اپنا گھربار سب کچھ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور عقرون سے جات تک اپنے سارے شہر بھی خالی کر دیے، فلسطینیوں نے اس بزدلی کی وجہ سے ان کا قتل عام کیا اور وہ مقدس تابوت بھی چھین لے گئے جو ان کے یہاں قبلہ کی طرح محترم تھا۔ (سموئیل ۷: ۱۴)

حضرت سموئیلؑ کی دعا و استغفار اور نصیحت سے جب خوف و ہراس اور بزدلی و دون ہمتی کی یہ کیفیت کچھ ختم ہوئی اور ان میں قدرے عزم و حوصلہ پیدا ہوا تو انھوں نے ان سے ایک سردار مقرر کرنے کی فرمایش کی تاکہ اس کی قیادت میں اپنے دشمنوں سے لڑ کر اپنے مفتوحہ علاقوں کو دوبارہ حاصل کر سکیں، حضرت سموئیلؑ کو انکی بزدلی کا تجربہ تھا، اس لیے انھوں نے اپنے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ تم لوگ دشمن کا مقابلہ نہ کر سکو گے، مگر انھوں نے کہا کہ ہم کو اپنے بال بچوں اور علاقوں سے نکال دیا گیا ہو تو بھلا ایسی صورت میں بھی ہم لڑنے سے گریز کرینگے، مگر ہوا وہی جس کا حضرت سموئیلؑ کو اندیشہ تھا۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ (بقرہ : ۲۴۶)

پس جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو بجز تھوڑے لوگوں کے سب نے اس سے روگردانی کی،

پھر جب کسی طرح یہ لوگ دشمن کے سامنے پہنچے تو بولے :-

لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ (بقرہ : ۲۴۹)

اب ہم میں جالوت اور اسکی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں۔

انکی بزدلی کا یہی عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا، وہ مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے، قریش کو بھی برابر اکساتے اور بھڑکاتے لیکن کبھی کھل کر سامنے آنے کی ہمت نہ کرتے، انکی لن ترانی سے کبھی مسلمان گھبراتے تو انھیں یہ کہکر تسکین دیجاتی کہ گھبراؤ نہیں،

لَن يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى وَإِن يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ (آل عمران ۱۱۱)

دلآزار باتوں کے سوا وہ تمھیں ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، اگر وہ تم سے جنگ کرینگے تو پیٹھ دکھا دینگے

قرآن کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح نکلی، مدینہ اور اسکے اطراف سے یہود کے زور و اثر کا خاتمہ ہو گیا، بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقاع اور یہود خیبر سب بھاگ کھڑے ہوئے اور جلاوطن کر دیے گئے مگر کہیں جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔

حرص و بخل

یہود کی زرپرستی اور دنیا طلبی نے ان کو بڑا حریص اور نہایت بخیل بنا دیا تھا، انکی تنگدلی، حرص، بخل اور خود غرضی آجتک ضرب المثل ہے، آج بھی انکا وہی حال ہے، وہ تمام وسائلِ دولت پر قابض ہو کر ساری دنیا پر معیشت کے دروازے بند کر دینا چاہتے ہیں، حالانکہ توراۃ نے ان کو تاکید کی تھی کہ

"تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اسکے غلام اور اسکی لونڈی اور اسکے بیل اور اسکے گدھے اور اسکی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر" (خروج ۲۰ : ۱۷)

اوپر کی سطور میں یہود کی چند بڑی بڑی اخلاقی خرابیوں کا ذکر کیا گیا ہے، انکی تمام برائیوں کا احاطہ اس مختصر مقالہ میں ممکن نہیں ہے، مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اخلاقی انحطاط کی آخری حد کو پہنچ گئے تھے،

اس زبوں حالی کا جو انجام ہوا اس کی داستان آیندہ اشاعت میں سنیے گا۔

(باقی)

آلِ مقسم قیقانی سندھی

امام ابن عُلَیَّہ بصری اور دیگر علماء و محدثین

از مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

ہندوستان کے جو علمی و دینی خانوادے عرب کے مطلع پر صدر اسلام میں چمکے اور انکے علم و فضل کی روشنی سے صدیوں تک عالمِ اسلام منور رہا، ان میں سے ایک خانوادہ آلِ مقسم قیقانی سندھی بھی ہے، جس میں ریحانۃ الفقہاء، سید المحدثین، امام حافظ ابن عُلیّہ اسمٰعیل بن ابراہیم بن مقسم بصری، ربعی بن ابراہیم بن مقسم بصری، ابراہیم بن اسمٰعیل ابن عُلیّہ، حماد بن اسمٰعیل بن علیّہ اور محمد بن اسمٰعیل بن عُلیّہ جیسے مشاہیر علماء و محدثین گذرے ہیں، آج ہم پہلی بار معارف کے صفحات پر ہندوستان کے اس علمی و دینی خاندان کا تذکرہ پیش کر رہے ہیں، جس کے کارنامے آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں،

قیقان (کیکان، قلات)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے "آلِ مقسم قیقانی سندھی" بصری کے قدیم وطن قیقان کے محلِ وقوع، تاریخی حالات اور فتوحات کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا جائے تاکہ اندازہ ہو کہ کفر و شرک کی کیسی شدید ظلمتوں سے ایمان و یقین اور علم و فضل کے یہ آفتاب و ماہتاب نمودار ہوئے ہیں، قدیم جغرافیہ نویسوں کے بیان کی رو سے خراسان اور زابلستان کے درمیان قیقان نامی ایک بہت بڑا علاقہ تھا، اسی نام سے شہر بھی موسوم تھا جو مقامی راجہ کا دار السلطنت تھا، بلاذری نے یہاں کے فتوحات کے سلسلے میں لکھا ہے:-

والقیقان من بلاد السند — خراسان کی حدود سے متصل قیقان سندھ
حمایلی خراسان[1] — کے شہروں میں سے ہے۔

ابن خرداذبہ نے المسالک والممالک میں اسے خراسان کی سمت سندھ کا پہلا شہر بتایا ہے[2] یاقوت نے معجم البلدان میں اسے طبرستان کے قریب کا شہر لکھا ہے[3]،

قیقان گیگان کا معرب ہے، موجودہ ریاست قلات اسی کے حدود میں واقع ہے، قیقانی گھوڑے اور ٹٹو قدیم زمانے سے مشہور ہیں، حتی کہ اب بھی ان کی یہ شہرت باقی ہے، اور جدید تحقیقات کی رو سے گیگان یا کیکانان وہ ملک ہے جسے رائے خاندان کے زمانہ میں مشہور سیاح ہوان سانگ نے "کی گیانگ نا" کے نام سے ذکر کیا ہے، ملک کیکانان نوشکی کے قریب قصدار (قزدار) اور قندابیل (گنڈاوا) کے درمیان کا علاقہ تھا، اس مقام پر رائے خاندان کی مملکت کی سرحد کا ذکر ہے، جس سے مراد سرحد کیکانان ہے، موجودہ ریاست قلات بلکہ سراوان اور جھالاوان کی ریاستیں بھی رائے خاندان کی مملکت میں شامل تھیں[4]

فتوحات اور سبایا وغنائم

قیقان کا علاقہ نہایت دشوار گذار اور پہاڑی تھا، یہاں کے باشندے بڑے بہادر اور جنگ جو تھے، باہر کے حملہ آوروں کے لیے یہ علاقہ بڑا خطرناک اور مشکلات سے پر تھا، اس کا ایک حصہ (قندابیل) جو حدود سندھ میں تھا عہد فاروقی میں فتح کر لیا گیا تھا، اور اس زمانہ سے برابر مسلمانوں کے تصرف میں رہا، البتہ قیقان کا جو علاقہ طبرستان و خراسان سے متصل تھا وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی، اس کے بعد کئی سخت معرکے ہوئے جن میں مسلمانوں کو جان و مال کا نقصان عظیم برداشت کرنا پڑا لیکن آخر کار مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا اور پورا قیقان ان کے قبضہ میں آگیا، ان جنگوں کی مختصر سرگذشت ذیل کی سطور میں

۱ فتوح البلدان ص۴۳۲ ۲ المسالک والممالک ص۵۶ ۳ معجم البلدان ج ۷، ص۱۹۶ ۴ حاشیہ فتحنامہ سندھ ترجمہ چچ نامہ ص۳۸۴ از محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب۔

بیان کی جارہی ہے۔

پہلا اسلامی حملہ

قیقان کے علاقہ پر پہلا اسلامی حملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا، خلیفہ ابن خیاط نے اس جنگ کا سنہ ۳۸ھ قرار دیا ہے لیکن بلاذری کے نزدیک یہ معرکہ ۳۸ھ کے آخر یا ۳۹ھ کے شروع میں اس طرح پیش آیا کہ حضرت حارث بن مرہ عبدیؓ نے مسلمانوں کو غزوہ ہند کی دعوت دی اور فدائیوں کی فوج لیکر مکران کے آگے بلاد قندابیل تک پہنچ گئے، خلیفہ بن خیاط کا بیان ہے

وغل فی جبال القیقان — انھوں نے قیقان کے پہاڑی علاقوں
فاصاب سبایا کثیرۃ — میں گھس کر بہت سے جنگی قیدی حاصل کیے۔

دوسری جگہ ہے کہ حارثؓ بن مرہ عبدی نے حضرت علیؓ کے زمانہ میں فوج جمع کرکے بلاد مکران میں جہاد کیا اور کامیابی کے بعد مال غنیمت پایا، مگر مقامی باشندوں نے ان کے مقابلہ کے لیے زبردست فوج اکٹھا کی، اور شدید جنگ ہوئی جس میں حضرت حارثؓ بن مرہ اور اسلامی فوج کا بیشتر حصہ شہید ہوگیا[1]،

اور بلاذری کی روایت ہے کہ ۳۸ھ کے آخر یا ۳۹ھ کے شروع میں حارثؓ بن مرہ عبدی نے حضرت علیؓ کی اجازت سے اس طرف توجہ کی اور رضاکارانہ فوج لیکر حملہ کیا،

فظفر واصاب مغنما وسبیا — جس میں انھوں نے فتح یابی کے بعد مال غنیمت
وقسم فی یوم واحد ألف رأس — اور قیدی حاصل کیے اور ایک دن میں ایک ہزار

اس کے بعد ۴۲ھ میں حارثؓ بن مرہ اور ان کے چند رفیقوں کے علاوہ تمام ساتھی شہید ہو گئے، اس حادثہ کے بعد کچھ عرصہ تک مسلمانوں کی طرف سے خاموشی رہی،

۱ تاریخ خلیفہ ج ۱ ص ۲۱۴ و ۲۱۵ و ۲۲۹ ۲ فتوح البلدان ص ۴۳۱

دوسرا حملہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں قیقان پر دوسرا حملہ ۴۲ھ میں ہوا، اور قبیلہ ازد کے مشہور بہادر حضرت راشد بن عمر جدیدی عبدی نے اسلامی فوج لیکر مکران کی فتوحات کے سلسلہ میں قیقان کو فتح کیا اور گذشتہ شکست اور نقصان کا بدلہ لینے میں شدید اقدامات کیے، بلاذری نے لکھا ہے

ثم غزا القیقان فظفر وغنم الغارات (فتوح البلدان ص ۴۲۲)

انھوں نے فتح مکران کے بعد قیقان میں جہاد کرکے کامیابی حاصل کی اور پے در پے حملے کیے۔

یعقوبی نے بھی راشد بن عمر کی فتوحات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

فغزا القیقان فظفر وغنم (تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۵۱)

انھوں نے قیقان میں جنگ کرکے کامیابی اور مال غنیمت حاصل کیا۔

اس مہم میں حضرت سنان بن سلمہ ہذلی رضی اللہ عنہ شریک تھے، جب امیر لشکر راشد بن عمر جدیدی جنگ کے دوران ایک غزوہ میں شہید ہوگئے تو حضرت سنان بن سلمہ ہذلی نے اسلامی فوج کی امارت سنبھالی،

تیسرا حملہ تیسری بار حضرت معاویہ کے دور میں ۴۵ھ میں حضرت عبداللہ بن سوار عبدی نے قیقان میں جنگ کرکے مال غنیمت حاصل کیا، خلیفہ بن خیاط کا بیان ہے:

فافتتح القیقان واصاب غنائم (تاریخ خلیفہ ج ۱ ص ۱۹۲)

انھوں نے قیقان فتح کیا اور اموال غنیمت پائے

بلاذری نے لکھا ہے

فغزا القیقان فاصاب مغنما (فتوح البلدان ص ۴۳۱)

ابن سوار نے قیقان میں غزوہ کرکے غنیمت پائی

اور قاضی رشید بن زبیر نے کتاب الذخائر والتحف میں تصریح کی ہے کہ

وانہ غزا بلاد القیقان فاصاب منہ غنائم (کتاب الذخائر والتحف ص ۱۷)

ابن سوار نے بلاد قیقان میں جہاد کرکے ان سے غنائم حاصل کیے۔

حضرت عبداللہ بن سوار نے قیقان کی فتوحات کے بعد امن و امان قائم کیا، وہاں کے راجہ نے اطاعت قبول کی اور ان کی خدمت میں جزیہ اور فدیہ پیش کیا، سندھ کے عمدہ اور بیش بہا تحائف بھیجے، اس کے بعد عبداللہ بن سوار حضرت معاویہ کی خدمت میں شام واپس چلے گئے، اور قیقان میں مشہور بزرگ حضرت کرز بن ابوکرز وبرہ حارثی عبدی انکے جانشین بنے، خلیفہ نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن سوار نے حضرت معاویہ کو قیقانی گھوڑے پیش کیے، عرب میں براذین قیقانیہ انہی گھوڑوں کی نسل سے ہیں،

چوتھا حملہ قیقان پر چوتھی بار ۴۷ھ میں حملہ ہوا، صورت یہ ہوئی کہ عبداللہ بن سوار جن دنوں حضرت معاویہ کے پاس شام میں مقیم تھے، قیقان والوں نے بدعہدی کرکے بغاوت کی راہ اختیار کی اور مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے زبردست فوجی طاقت جمع کرلی، اس لیے حضرت معاویہ نے عبداللہ بن سوار کو دوبارہ یہاں کی امارت پر روانہ کیا، وہ چار ہزار فوج لیکر مکران آئے اور کچھ دنوں وہاں قیام کرکے قیقان کا رخ کیا، مقامی باشندوں سے زبردست جنگ ہوئی، اس بار بھی اسلامی فوج کا بہت نقصان ہوا، امیر لشکر حضرت عبداللہ بن سوار اور فوج کا اکثر حصہ میدان جنگ میں کام آگیا، جو لوگ بچ گئے وہ مکران چلے گئے،[۱]

پانچواں حملہ ۵۰ھ میں قیقان پر پانچواں حملہ ہوا جس کی سرگذشت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سوار اور اسلامی فوج کی بڑی تعداد کی شہادت پر حضرت معاویہ کو بہت رنج ہوا، اور انھوں نے غور و فکر کے بعد حضرت سنان بن سلمہ ہذلی کو یہاں کا مستقل امیر مقرر کیا، جنھوں نے مکران و قصدار اور قیقان وغیرہ کو پھر سے فتح کیا، اور بیان ہوچکا ہے کہ

---

[۱] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۲۷۸

دوسرے حملہ کے وقت حضرت سنان بن سلمہؓ یہاں موجود تھے، اور راشد بن عمرؓ جدیدی عبدی کی شہادت پر وقتی امیر بنائے گئے تھے، خلیفہ بن خیاط نے لکھا ہے کہ راشد بن عمرؓ (عبد اللہ بن سوار) کی شہادت کے بعد ۵۰ھ میں امیر عراق حضرت سنان بن سلمہؓ کو حدود ہند کی ولایت پر مقرر کیا، ان کی فوج میں حضرت ابو الیمانؒ نیال معلی بن راشد ہذلی بصری بھی تھے، جو عبادت و ریاضت میں مشہور تھے، ان کا بیان ہے کہ ہم نے سنان بن سلمہ کے ساتھ قیقان میں جہاد کیا، ہمارے سامنے دشمن کی بہت بڑی فوج تھی، سنان بن سلمہ نے اسلامی فوج کو مخاطب کرکے کہا

ابشروا، فانتم بین خصلتین — تم لوگوں کو بشارت ہو کہ تم دو کاموں

الجنة والغنيمة — یعنی جنت اور غنیمت کے درمیان ہو۔

اس کے بعد انھوں نے سات پتھر لیکر کہا کہ جب دیکھو کہ میں نے حملہ کر دیا تو تم بھی حملہ کر دینا، یہ کہکر وہ کچھ دیر رکے رہے، جب آفتاب نصف النہار پر ہوا تو ایک پتھر سامنے پھینکا اور بلند آواز سے نعرۂ تکبیر کہا، پھر اسی طرح ایک ایک پتھر پھینکتے رہے، یہاں تک کہ صرف ساتواں پتھر رہ گیا، آخر کار سورج ڈھلنے کے بعد اسے بھی پھینکا اور حمٓ لاینصرون کہکر نعرۂ تکبیر بلند کیا، پھر حملہ کیا، ان کے ساتھ ہم نے بھی حملہ کر دیا اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے، ہم نے چار فرسخ تک تعاقب کرتے ہوئے ان سے جنگ کی، یہاں تک کہ ہم دشمن کی ایک جماعت کے پاس پہنچے جو ایک قلعہ میں پناہ گزیں تھی، انھوں نے ہم کو دیکھتے ہی کہا کہ خدا کی قسم آپ لوگوں نے ہم سے جنگ نہیں کی ہے، بلکہ ایسے لوگوں نے ہمیں مغلوب کیا ہے جنھیں ہم اس وقت آپ لوگوں کے ساتھ نہیں دیکھ رہے ہیں، وہ لوگ ابلق گھوڑوں پر سوار تھے، ان کے سروں پر سفید عمامے تھے، یہ سنکر ہم نے ان سے کہا:

ذلك نصر من الله — یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری مدد تھی،

پس واپس ہونے پر پتہ چلا کہ ہم میں سے صرف ایک سپاہی شہید ہوا ہے، ہم نے سنان بن سلمہؓ سے پوچھا کہ سورج کے ڈھلنے تک آپ حملہ کرنے سے کیوں رکے رہے، انھوں نے جواب دیا کہ

كذلك يصنع رسول الله صلى الله عليه وسلم (تاریخ خلیفہ ج۱، ص ۲۵۰) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوات میں ایسا ہی کیا کرتے تھے،

الغرض سرزمین قیقان چار مرتبہ مجاہدین اسلام کا مشہد بننے کے بعد پانچویں مرتبہ مسلمانوں کے قبضہ میں آئی، اب کے مرتبہ حضرت سنان بن سلمہ ہذلی رضی اللہ عنہ جیسے دیندار اور خدا پرست صحابی کی امارت اور حضرت ابو الیمان نیال ہذلی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عابد و زاہد کی شرکت اور ملائکۃ الرحمٰن کی نصرت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی سے نوازا اور قیقان کا وسیع علاقہ اسلامی مملکت میں شامل ہوا۔

مقسم قیقانی کوفی

امام ابن عُلیہ وغیرہ کے دادا مقسم اسی قیقان کے باشندے تھے، وہ ان ہی غزوات میں سے کسی غزوہ میں گرفتار کرکے جنگی قیدی کی حیثیت سے عرب لائے گئے، اس کی تصریح سب سے پہلے ابن عُلیہ کا زمانہ پانے والے مورخ و عالم ابن سعد نے طبقات میں ان الفاظ میں کی ہے:

اسمعيل بن ابراهيم بن مقسم مولى عبد الرحمن بن قطبة الاسدي، اسد خزيمة وكان مقسم من سبي القيقانية مابين خراسان وزابلستان (طبقات ابن سعد ج، ص ۳۲۵)

اسمٰعیل بن ابراہیم بن مقسم مولی عبد الرحمٰن ابن قطبہ اسدی کے دادا مقسم قیقان کے قیدی تھے جو خراسان اور زابلستان کے درمیان واقع ہے۔

خطیب نے بھی تاریخ بغداد میں ابن سعد کی روایت سے یہی الفاظ نقل کیے ہیں[1]، اور بعد کے مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں ابن سعد ہی کے حوالہ سے یہی درج کیا، البتہ اس میں وکان مقسم جدہ ہے، یعنی جدہ کا اضافہ یا تصریح ہے[2]۔

مقسم کس جنگ میں گرفتار ہوکر کب کوفہ آئے، اور قبیلہ اسد بن خزیمہ کے غلام ہوئے، ان باتوں کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی ہے، البتہ یہ یقین ہے کہ ۳۶ھ سے ۵۰ھ تک کی پانچ جنگوں میں کسی میں گرفتار ہوکر کوفہ لائے گئے، پندرہ سولہ سال کی مدت میں پانچ مرتبہ معرکہ کارزار گرم ہوا، ہر جنگ میں مسلمانوں کو بہت سے قیدی اور غلام ہاتھ لگے، ہمارا خیال ہے کہ پہلی جنگ میں مقسم گرفتار ہوئے تھے، جو مال غنیمت اور جنگی قیدیوں کے حصول کے اعتبار سے سب سے زیادہ کامیاب تھی، بلاذری کا یہ بیان پہلے گذر چکا ہے کہ

فظفر واصاب مغنما وسبیًا	حارث بن مرہ عبدی نے فتح کے بعد مال غنیمت
وقسم فی یوم واحد الف راس	اور قیدی حاصل کئے اور ایک دن میں
(فتوح البلدان ص ۴۲۱)	ایک ہزار قیدیوں کو اسلامی فوج میں تقسیم کیا،

خلیفہ بن خیاط نے بھی ان کی کامیابی کے بارے میں لکھا ہے

ووغل فی جبال القیقان فاصاب	قیقان کے پہاڑوں میں گھس گئے اور بہت
سبایا کثیرۃ (تاریخ خلیفہ ج ۱ ص ۱۱۴)	سے جنگی قیدی پائے۔

اگر مقسم ۳۳ھ یا ۳۴ھ کی جنگ قیقان میں گرفتار ہوکر کوفہ لائے گئے، تو اس وقت کوفہ کی آبادی پر بیس بائیس سال سے زائد مدت گذر چکی تھی، اور وہاں عربوں کے مشہور قبائل مستقل طور سے سکونت پذیر ہو چکے تھے، جن میں قبیلہ اسد بن خزیمہ بن مدرکہ کو وہاں کی شہری اور تمدنی زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل تھی، اور اس کی بنائی ہوئی مسجدیں، مکانات

۱ تاریخ بغداد ج ۷ ص ۲۳۰ ۲ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۰۱

اور دکانیں اس کے جاہ و جلال، شان و شوکت اور دولت و ثروت کو ظاہر کرتی تھیں، چنانچہ اس قبیلہ کے ایک فرد سماک بن مخرمہ اسدی کی مسجد سماک کوفہ کی نہایت پُرشکوہ اور پائیدار مسجد شمار کی جاتی تھی، مشہور شاعر اخطل نے اس کے بارے میں کہا ہے؛

ان سماکا بنی مجدا لاسرتہ	حتی الممات وفعل الخیر یبتدر
قد کنت احسبہ قینا واخبرہ	فالیوم طیر عن اثوابہ الشرر[1]

اسی طرح بنو اسد کی ایک شاخ بنو جذیمہ تھی، جس کے نام سے کوفہ میں مسجد بنی جذیمہ تھی، وہ بڑی اور لمبی چوڑی تھی، اس میں صرافوں کی کئی دکانیں تھیں[2]،

کوفہ کے ان ہی بنو اسد بن خزیمہ کے خاندان میں عبدالرحمٰن بن قطیہ اسدی اپنے زمانہ کے نامور سردار تھے، مقسم ان ہی کی ولا و ملکیت میں آئے، عرب میں اسد بن ربیعہ بن نزار بھی مشہور قبیلہ تھا، اس لیے دونوں بنو اسد میں فرق کے لیے "اسدی اسد خزیمہ" کی تصریح کر دی جاتی ہے،

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقسم نے غلامی کے دور میں کوفہ میں تجارت کر کے اسکی آمدنی سے اپنے کو آزاد کرا لیا تھا، وہ بزاز یعنی کپڑے کے تاجر تھے، بعد میں ان کے لڑکے ابراہیم نے بھی کوفہ میں بزازی کا پیشہ اختیار کیا، اور اس میں اتنی ترقی کی کہ کوفہ اور بصرہ میں ان کی تجارت کا سلسلہ جاری ہو گیا، اس زمانہ میں کوفہ اور بصرہ کے غلام عام طور سے تجارت کر کے بڑی بڑی رقمیں جمع کرتے تھے، اور اپنے آقاؤں سے مکاتبت پر آزادی حاصل کرنے میں ان سے کام لیتے تھے، محمد بن حبیب بغدادی نے کتاب المحبر میں تسمیۃ اشراف مکاتبی البصرۃ والکوفۃ کے باب میں ایسے بہت سے غلاموں کا تذکرہ کیا ہے، جنھوں نے تجارت کر کے تیس ہزار، چالیس ہزار، ستر ہزار اور ایک لاکھ درہم پر اپنے آقاؤں سے آزادی حاصل کی تھی، (ص ۳۴۰ تا ۳۴۴)

۱ فتوح البلدان ص ۲۸۲ ۲ ایضاً ص ۲۸۴

ابراہیم بن مقسم کوفی مقسم کے بیٹے ابراہیم اشرف ممالیک میں سے تھے، انھوں نے اپنے والد کے کام کو آگے بڑھا کر کپڑے کی تجارت کو ترقی دی اور کوفہ و بصرہ میں اس کو فروغ دیا، ابن سعد نے لکھا ہے

وکان ابراهيم بن مقسم تاجرًا من اهل الكوفة، وكان يقدم البصرة بتجارته فيبيع ويرجع (طبقات ابن سعد ج، ص ۳۲۵)	ابراہیم بن مقسم اہل کوفہ کے تاجر تھے اور اور اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں بصرہ آتے جاتے تھے، پھر فروخت کرکے واپس جاتے تھے۔

ابراہیم بزاز تھے، یعنی کپڑے کی تجارت کرتے تھے، اس کا پتہ امام ابوداؤد کے اس قول سے چلتا ہے، جو انھوں نے ابن عُلیّہ کے بارے میں کہا ہے:

وهو رجل من اهل الكوفة بزاز، هو مولى بني اسد	وہ کوفہ کے بزاز یعنی پارچہ فروش تھے، وہ بنی اسد کے آزاد شدہ غلام تھے،

ابراہیم بڑے مالدار اور خوش حال تھے۔ بسلسلۂ تجارت بصرہ آتے جاتے تھے، بعض اوقات وہاں قیام طویل ہو جاتا تھا، اس لیے وہیں عُلیّہ بنت حسان نامی ایک عورت سے نکاح کر لیا، جو بنو شیبان کی مولاۃ یعنی آزاد شدہ باندی تھی، یہ عورت باندی ہونے کے باوجود بڑی دیندار اور صاحبِ فضل و کمال تھی، دنیاوی اعتبار سے بھی اسے خاص وجاہت حاصل تھی، بصرہ کے علاقہ عوقہ میں اس کا شاندار مکان تھا جو اسی کے نام سے مشہور تھا، بصرہ کے علما، و فقہا، اور عباد و زہاد میں سے حضرت صالح مری وغیرہ علیہ بنت حسان کے یہاں علمی و دینی استفادہ کے لیے حاضر ہوتے اور وہ باہر نکل کر ان حضرات سے مختلف موضوعات پر کھل کر گفتگو اور سوال و جواب کرتی تھی،[۱] علیہ جیسی ذی علم اور صاحبِ علم و کمال عورت سے شادی معمولی

[۱] طبقات ابن سعد ج، ص ۳۲۵

آدمی کے امکان میں نہ تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم بڑی تجارت کے ساتھ علم و فضل میں بھی مشہور تھے، اور لوگوں میں انھیں بڑی مقبولیت حاصل تھی،

عُلیّہ بنت حسان مولاۃ بنی شیبان (بنی شیبان کی آزاد کردہ باندی تھی، جیسا کہ ابن سعد اور خطیب وغیرہ نے تصریح کی ہے، لیکن اس کے برخلاف صاحب خلاصہ تذہیب الکمال نے علیہ بنت حسان کو بھی مولاۃ بنی اسد بن خزیمہ بتایا ہے،[۱] جو بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتا، شاید ابراہیم کی نسبت سے اسے بھی اسدی لکھ دیا ہو، اللہ تعالیٰ نے ابراہیم بن مقسم اور علیہ بنت حسان کی شادی میں بڑی خیر و برکت عطا فرمائی، ان سے دو لڑکے اسمٰعیل اور ربعی پیدا ہوئے اور دونوں نے زمانہ کے مطابق علم دین حاصل کیا، مگر اسمٰعیل بن ابراہیم جو ابن علیہ کی کنیت سے مشہور تھے، سید المحدثین اور ریحانۃ الفقہا ہوئے اور ان کی نسل میں علم دین صدیوں تک جاری رہا۔ (باقی)

[۱] خلاصہ تذہیب الکمال ص ۲۷

روداد

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

از ڈاکٹر ماجد علی خاں لکچرر اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ دہلی

"ذاکر حسین انسٹیٹوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی جانب سے "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے موضوع پر ایک سیمینار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ۲۶ تا ۲۹ دسمبر ۱۹۷۷ء منعقد ہوا، ذیل کی سطور میں اس کی روداد پیش کی جارہی ہے، تاکہ جو اہل علم اس موقع پر موجود نہ تھے، وہ بھی سیمینار کے مباحث سے واقف ہوسکیں اور منتظمین کو مفید مشورے دے سکیں، یہ روداد ڈاکٹر ماجد علی خاں صاحب لکچرر شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مرتب کی ہے، جہاں کہیں کچھ کمی اور زیادتی محسوس ہوئی تو حسب ضرورت حذف و اضافہ کر دیا گیا۔

(معارف)

موجودہ زمانہ میں ایک طرف لادینی اور الحاد کا سیلاب مختلف راستوں سے امنڈ رہا ہے، اور دوسری طرف سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے مذہبی حلقوں کے سامنے نئے نئے مسائل کھڑے کر دیے ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے گہرے مذہبی علم اور عصر حاضر کے تقاضوں سے واقفیت ضروری ہے، ان مشکلات کو تنہا نہ مذہبی درسگاہوں کے فارغ التحصیل حل کر سکتے ہیں نہ یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ، کاروبار حیات کی وسعت اور علوم و فنون کی کثرت کے اس دور میں ایسے جامع العلوم

اشخاص کا وجود محال ہے جو زندگی کے ہر میدان میں پورے طور پر رہنمائی کر سکیں، اس لیے اسکے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ علوم اسلامی کے ماہر اور جدید تعلیم کے صاحب نظر اصحاب جمع ہو کر ان مسائل پر غور کریں اور ایسا حل نکالیں جو کسی تحریف و انحراف کے بغیر اصول اسلام کے مطابق اور وقت کے تقاضوں کے موافق ہو، یہ سیمینار اسی غرض سے منعقد کیا گیا تھا اس میں مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء، اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب کافی تعداد میں شریک ہوئے اور پہلو بہ پہلو بیٹھ کر مختلف مسائل پر غور کیا اور خلوص و اعتماد کی فضا میں مفید فیصلے کئے،

شاید اس نوعیت کا یہ پہلا اجتماع تھا، اس میں دار العلوم دیوبند، دار العلوم ندوۃ العلماء، مدرسۃ العلم فرنگی محل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے فضلاء، اور دہلی، مدراس، بنارس اور لکھنؤ کے ارباب فکر و نظر کے علاوہ بعض مسیحی اداروں کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔

اس موقع پر جناب شہاب الدین صاحب انصاری ناظم کتب خانہ جامعہ نے اسلامی کتب کی ایک نمائش کا انتظام بھی کیا تھا، جس میں قرآن مجید، اسلامی علوم، اہم کتابیں اور مسلم آرٹس کے دلکش نمونے جمع کئے گئے تھے،

سیمینار کا افتتاح صدر جمہوریۂ ہند عزت مآب جناب فخر الدین علی احمد صاحب نے کیا، اور افتتاحی جلسہ کی صدارت دار العلوم دیوبند کے مہتمم جناب مولانا محمد طیب صاحب نے کی، اس جلسہ میں اتنی بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے کہ پنڈال اپنی وسعت کے باوجود تنگ نظر آنے لگا، اس موقع پر مندوبین کے علاوہ بیرونی ممالک کے سفراء اور دہلی کے بہت سے اہل علم اور عمائد بھی موجود تھے۔

سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریۂ ہند جناب فخر الدین علی احمد صاحب نے فرمایا

"اسلام میں اتنی وسعت ہے کہ وہ ہر دور کے لیے ایک پیغام اور رہنمائی رکھتا ہے، اسلام نے جمود پر حرکت کو ترجیح دی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ہر زمانہ کے لیے ہے، بدلتے ہوئے حالات میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید ہماری زندگی کے ہر گوشہ میں تشریح طلب ہوگئی ہے، یوں تو اسلام نے زندگی کے ہر پہلو پر شروع ہی سے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا ہے، جس کو وقت کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے، حصول علم، حقوق اہل وعیال، حب الوطنی، قومیت، رواداری، امن، ہم آہنگی، اتحاد واتفاق، مساوات، معاشرتی انصاف، ہمدردی غرض دینی ودنیاوی اعتبار سے کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کا حل ہم کو قرآن پاک اور سیرۃ النبی سے نہ ملتا ہو لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اور علم کے پھیلاؤ نے کائنات، اپنی ذات اور سماجی زندگی کے بارے میں انسان کی نظروں کو پہلے سے زیادہ وسعت اور گہرائی عطا کر دی ہے، فکر اسلامی کی تشکیل جدید کو سائنس کی ترقی، علوم کے پھیلاؤ، تمدن کی پیچیدگی اور بدلتے ہوئے سماجی رشتوں کی پوری رعایت دھیان میں رکھنی ہوگی، ہمیں اس اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنا چاہئے کہ ایسا کرنا ممکن ہے کیونکہ فکر اسلامی ماضی میں بھی ترقی کی صلاحیت کا مظاہرہ کر چکا ہے، تاریخ اسلام کا یہی نازک مرحلہ تھا جب ہندوستان میں شاہ ولی اللہؒ، سرسید احمد خاں، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے علماء اور مفکرین نے فکر اسلامی کی تشکیلِ نو کا کام ہاتھ میں لیکر مایوسی کو امید اور جمود کو حرکت سے بدلنے کی کوششیں کیں۔"

صدر جمہوریۂ ہند نے تجویز کیا کہ "وقت کا تقاضا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے ہم آگے بڑھیں، اپنے خیالات کو غور وفکر کی نئی روشنی میں ڈھالیں اور ترقی کی دوڑ میں دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چلیں، اس کے لیے وسیع النظر

اور وسیع القلب ہونے کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ "کسی بھی ادارہ کی ترقی اور وسعت کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے دائرۂ کار کا تعین ہو اور اسکے مناسب اشخاص کا انتخاب ہو، پھر وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق راہیں پیدا کر لیتے ہیں، جن مسائل پر غور کرنا ہو ان کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرنا چاہئے جو اس کے اصول وفروع سے بخوبی واقف ہوں، اسلام ایک ایسا دین ہے جو ہر دور کے تقاضے پورے کر سکتا ہے، کتاب وسنت کی مشعلِ ہدایت نے ہر زمانہ میں رہنمائی کی، عرب کے سادہ ماحول سے اسلام آگے بڑھا تو ایرانی تہذیب، رومی تمدن اور یونانی علوم سے مڈبھیڑ ہوئی، مگر اللہ نے ایسے لوگوں کو پیدا کر دیا، جنھوں نے ان کے تار و پود بکھیر دیے، پھر باطنی علوم کا سامنا ہوا، مگر صوفیاء اسلام نے اس طلسم کو بھی توڑ دیا، پھر عقل پرستی کا دور اور اب سائنسی شہادات کا زمانہ ہے، اسلام کے اصول ہر دور میں اٹل رہے، عقائد وعبادات ناقابل تغیر ہیں، ہاں معاشرت ومعاملات کے مسائل پر غور ہوتا رہا ہے، اور علماء وفقہاء زمانہ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے رہے ہیں،

افتتاحی اجلاس میں جن لوگوں نے تقریریں کیں ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مسعود حسین خاں، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، شعبۂ اسلامک اینڈ عرب ایرانین اسٹڈیز کے صدر پروفیسر مشیر الحق اور ایرانی کلچرل کونسلر مسٹر ایف مجتبائی شامل ہیں،

شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا: "یہ سمینار عام سمیناروں سے مختلف ہے، ہندوستان میں اسلام ایک نئے موقف اور مسلمان ایک نئے ماحول میں موجود ہے، دیگر ہم وطنوں کی طرح اس کا عہد وپیمان بھی سیکولرزم، جمہوریت اور سوشلزم سے اٹل ہے،

جس کا تقاضا ہے کہ وہ ایک نئی نفسیات کا حامل ہو، اپنے مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب کا احترام کرتا ہو، جمہوری طریق حیات پر عامل ہو، اور سوشلزم کا معاشی وظیفہ رکھتا ہو، ان اقدار کے ڈھانچ میں جب ہندوستانی مسلمان کے ذہن کی ساخت و پرداخت ہوگی تو اس کے تمام افکار و تصورات میں تبدیلی اور توسیع ہوگی، مذہبی فکر کے بھی ان سانچوں اور ڈھانچوں پر جو سیکڑوں برس پہلے مخصوص حالات میں وضع کیے گئے تھے، از سر نو غور کرنا ہوگا، ہندوستانی مسلمان کا انداز فکر ایک ہی سلکِ دین کا گھر ہونے کے باوجود ایک عرب، ایک ایرانی اور ایک پاکستانی سے مختلف ہوگا، اسے تشریح، تفسیر اور تعبیر کے نئے مقامات سے گزرنا ہوگا، مذہبی فکر کی تشکیل نو کے اس عمل میں اسے ضمنی و حقیقی، فروعی و اصلی اور موقتی و ابدی اقدار کے فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا، ظاہر ہے ان کے نازک امتیازات کی تمیز کا حق صرف 'مکمل عالم' کو پہنچتا ہے، جو ایک طرف دینی علوم اور ان کے متعلقات کا ادراکِ کامل رکھتا ہو، اور دوسری طرف عصر جدید کے ان تقاضوں، عوامل اور محرکات کا واقف کار بھی ہو، جو حیات اجتماعی کو سیاسی، معاشرتی اور معاشی اعتبار سے زیر و زبر رکھتے ہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ ایسے ہی عالموں کی تخلیق چاہتی ہے، جو جدید و قدیم کے ماہر ہوں، جنکا اپنے محوروں سے براست تعلق ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حیات اجتماعی کی کلیت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اور درجاتِ علم پر مربوط انداز میں سوچنے کی اہلیت جو وارداتِ قلبی کی باطنیت کے ہم راز ہوں لیکن باخبر ہوں اس طبعی، معاشی اور معاشرتی ماحول سے جو ان کے ارد گرد پھیلا ہوا ہے، جن کی فکر نہ صرف اسلام بلکہ دیگر مذاہب سے تجدید کر سکتی ہو ان اقدار عالیہ اور مطلقہ کی جو اس ملک کی روایات اور طرز حیات میں صدیوں سے پیوستہ ہیں اور جو ہر لحظہ ہمارے عمل و کردار کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔

اس کے بعد انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ضیاء الحسن فاروقی نے انسٹی ٹیوٹ کا مختصر تعارف

کراتے ہوئے سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی، انھوں نے کہا کہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ جس قدر آج پیچیدہ ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا، لیکن یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو علمائے اسلام اور مسلم دانشور زیادہ دن تک نظر انداز نہیں کر سکتے، لیکن مشکل یہ ہے کہ علماء وقت کے علوم اور زمانہ کے نئے تقاضوں سے پورے طور پر آگاہ نہیں ہیں، اور جدید تعلیم گاہوں سے نکلے ہوئے افراد علوم اسلامی سے کوئی خاص واقفیت نہیں رکھتے ہیں، ضرورت ہے کہ ان دو مختلف حلقوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے، اس سمینار کے انعقاد کا یہی مقصد ہے۔

اس کے بعد ایرانی سفارت خانہ کے کلچر کونسلر ڈاکٹر مجتبائی نے سمینار کے موضوع پر انگریزی میں ایک مختصر تقریر کی، پھر پروفیسر مشیر الحق، جوائنٹ ڈائرکٹر سمینار اور صدر شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز جامعہ ملیہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

اس افتتاحی اجلاس کے بعد سہ پہر سے مقالات کے جلسے شروع ہوئے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) پہلا اجلاس ۲۶ دسمبر ۱۹۷۶ء ۳ ½ بجے سہ پہر سے ۸ بجے شب تک

صدر: جناب پروفیسر علی محمد خسرو، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱- جناب مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی دار المصنفین، اعظم گڈھ	اسلامی شریعت اور وقت کے تقاضے
۲- جناب پروفیسر مشیر الحق صاحب صدر شعبۂ اسلامک و عرب ایرانین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی	علم کلام اور شریعت کی نئی تعبیر

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۳۔ ڈاکٹر بدر الحسن عابدی بنارس ہندو یونیورسٹی	نئے ہندوستان میں اجتہاد کا مسئلہ (شیعی نقطۂ نظر)
۴۔ محمد رحمت علی صدر شعبۂ معاشیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	اسلام اور دولت کی منصفانہ تقسیم

(۲) دوسرا اجلاس، ۲۷ دسمبر ۷۶ء ۹ بجے صبح سے ایک بجے دوپہر تک۔

صدر: جناب مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، مشیر علمی دار المصنفین اعظم گڈھ و سابق ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱۔ جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ	جدید فکر اسلامی کی تشکیل میں تصوف کا حصہ
۲۔ جناب مولانا مجیب اللہ ندوی مہتمم جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ	فکر اسلامی کی تشکیل جدید، اسکے محرکات اور ضرورت
۳۔ جناب حسن الدین احمد اکاڈمی آف اسلامک اسٹڈیز، حیدرآباد	حدیث پر نظر ثانی کی ضرورت
۴۔ جناب ڈاکٹر یوسف کوکن، مدراس یونیورسٹی	امام ابن تیمیہ کا مجتہدانہ موقف
۵۔ جناب ڈاکٹر انور معظم عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد	جمال الدین افغانی اور علماء
۶۔ جناب ڈاکٹر عبد الحق انصاری وشوا بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن	علم کلام کا ایک تنقیدی جائزہ

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۷۔ جناب مولانا برہان الدین سنبھلی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	تقلید مثبت و منفی پہلو

(۳) تیسرا اجلاس ۲۷ دسمبر ۱۹۷۶ء، ۳½ بجے سہ پہر سے ۷ بجے شام تک۔

صدر: جناب بدر الدین طیب جی سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱۔ جناب پروفیسر سید مقبول احمد صدر شعبۂ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی	روایت اور تجدد: جدید نقطۂ نظر
۲۔ جناب نجات اللہ صدیقی شعبۂ معاشیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	نئے ہندوستان میں اجتہاد کا دائرۂ عمل
۳۔ جناب مولانا وحید الدین خاں، دہلی	جدید علم کلام اور اس کی اہمیت
۴۔ ڈاکٹر طاہر محمود شعبۂ قانون دہلی یونیورسٹی۔	عالم عربی میں قانونی اصلاحات
۵۔ جناب انوار علی خاں سوز شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	نو راسخ العقیدگی اور فکر اسلامی کی تشکیل جدید
۶۔ ڈاکٹر رفیق سید، شعبۂ سوشل ورک جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	اسلامی فکر کی تشکیل نو، عمرانیاتی نقطۂ نظر

(۴) چوتھا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۷۶ء، صبح ۹ بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک

صدر: جناب ڈاکٹر سید عابد حسین سکریٹری اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی۔

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱۔ جناب پروفیسر وحید الدین انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی	اسلامی فکر کی تشکیل نو اقبال کی نظر میں

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۲۔ جناب مولانا پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی ومدیر برہان	شاہ ولی اللہ کا نظریۂ اجتہاد
۳۔ جناب مولانا محمد رضا انصاری، شعبۂ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	مولانا عبدالحئی کا فقہی موقف اور نئے ہندوستان میں اس کی معنویت
۴۔ جناب ڈاکٹر کرسچین ٹرال۔ ودیا جیوتی، دہلی	سرسید احمد خاں اور علم کلام کا احیاء

(۵) پانچواں اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۷۷ء، سہ پہر ۳½ بجے سے ۷ بجے شام تک۔

صدر: جناب ڈاکٹر یوسف حسین سابق پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱۔ جناب ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری، شعبۂ سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	اسلامی قانون سازی: اصول وطریقۂ کار
۲۔ جناب ڈاکٹر غیاث الدین اڈلفی، ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ	الربط بین الاسلام والنصرانیہ
۳۔ جناب مولانا ریاست علی، دارالعلوم دیوبند	فقہ حنفی میں فہم معانی کے اصول
۴۔ جناب ڈاکٹر محمد اقبال انصاری، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	اجماع
۵۔ جناب مولانا سعید احمد پالنپوری، دارالعلوم دیوبند	فکر اسلامی کی تشکیل جدید: ضرورت اور لائحۂ عمل
۶۔ جناب مولانا عزیز احمد قاسمی، دارالعلوم دیوبند	فکر اسلامی اور شریعت کی نئی تعبیر

(۶) چھٹا اجلاس ۲۹ دسمبر ۱۹۷۷ء، صبح ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک

صدر: جناب حیات اللہ انصاری، ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی۔

نام مقالہ نگار	عنوان مقالہ
۱۔ جناب مولانا محمد تقی امینی، ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	حدیث کا تنقیدی مطالعہ
۲۔ جناب ڈاکٹر محمود الحق، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	مفتی محمد عبدہ کا مجتہدانہ موقف
۳۔ جناب مولانا ابوالعرفان ندوی، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	قیاس، استحسان اور عرف

وقت کی کمی کے باعث پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اور ڈاکٹر محمد سالم قدوائی ندوی (ریڈر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز عرب ایرانین اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ) اپنے مقالات نہیں پڑھ سکے، انکے مقالوں کے عنوان بالترتیب اس طرح ہیں: "عربی مدارس، نصاب تعلیم اور فکر اسلامی"، "سرسید کا مذہبی نقطۂ نظر ان کی تفسیر کی روشنی میں"۔

تمام مقالات بہت دلچسپی سے سنے گئے۔ سامعین میں مقالہ نگاروں اور مندوبین کے علاوہ مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام اور دانشوروں نیز مقامی حضرات نے بہت بڑی تعداد میں شرکت کی، ان میں پروفیسر محمد شفیع پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر انوار الحق حقی ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی، ریڈر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پروفیسر سید حسین محمد جعفری امریکن یونیورسٹی بیروت قابل ذکر ہیں، پروفیسر سید حسین محمد جعفری نے فکر اسلامی کی تشکیل جدید پر ایک مختصر تقریر بھی کی۔

مقالات پر بحث و گفتگو بڑی اچھی فضا میں ہوئی، جدید و قدیم درسگاہوں کے فضلا نے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی پوری کوشش کی، سب سے پہلا مقالہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی صاحب کا تھا، جس میں موصوف نے فرمایا "مسلمان اسلام کو خدا کا آخری دین، قرآن مجید کو آخری کتاب اور اپنے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو آخری پیغمبر سمجھتے ہیں، ایسی صورت میں اسلامی شریعت کو کس طرح جامد سمجھا جا سکتا ہے، جب قیامت تک قرآن مجید زندگی کا دستور العمل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت معیار عمل ہے تو ان کے اندر قدرۃً ایسی لچک ہونی چاہئے کہ اس تغیر پذیر دنیا میں اسلامی احکام پر عمل میں کوئی دشواری محسوس نہ ہو۔" آپ نے وضاحت کی کہ "دین کے اصل ماخذ کتاب و سنت ہی ہیں، اجماع اور قیاس کا درجہ انکے بعد ہے، ان میں یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ کتاب و سنت سے انحراف نہ ہونے پائے، حقیقی اجماع خلافت راشدہ کے ابتدائی دور کے بعد نہیں ہو پایا، البتہ ایسا ہوتا رہا ہے کہ اہل علم یا اربابِ حل و عقد نے غور کر کے کوئی بات طے کر لی اور جب اس کا اعلان ہوا تو کسی نے اختلاف نہیں کیا، اس طرح رفتہ رفتہ اس نے تواتر عملی کی شکل اختیار کر لی، ایسے اجتماعی فیصلے کی بھی بڑی اہمیت ہے لیکن بعد کے زمانے میں جب حالات و مصالح کی نوعیت وہ نہ رہ گئی جس کی بنا پر پہلا اجتماعی فیصلہ کیا گیا تھا اور اس کے برعکس موجودہ حالات و مصالح کا تقاضا کچھ اور ہو تو اس پر اہل علم نظر ثانی کر سکتے ہیں، البتہ کتاب و سنت کا خیال ہر حال میں رکھنا پڑے گا۔" مولانا عبدالسلام صاحب نے موجودہ حالات میں اجتماعی فیصلوں کے لیے ایک ایسی کمیٹی کی تشکیل کی تجویز پیش کی جس میں علوم اسلامیہ کے ماہرین کے ساتھ ایسے جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی شامل ہوں جو عصر حاضر کے مسائل سے گہری نظری واقفیت کے ساتھ مکمل عملی تجربہ بھی رکھتے ہوں۔

جناب پروفیسر مشیر الحق اپنے مقالہ میں زمانۂ حال اور مستقبل میں رونما ہونے والے تقاضوں کے

پیش نظر اُن علتوں پر اظہار خیال کیا جو کہ مختلف احکامات کے تحت منصوصات میں بیان کی گئی ہیں، آپ نے فرمایا "ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحی کو بذات خود تو دوام اور قطعیت کا درجہ حاصل ہے لیکن اس کا جو مفہوم ذہن انسانی نے متعین کیا ہے، اس کی وہ حیثیت نہیں ہے، علم الٰہی کا احاطہ انسان کے بس میں نہیں ہے، اسکی عقل تغیر پذیر حالات و کیفیات کی تابع ہے وہ زمان و مکان کے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی ہے، منشائے ایزدی کا مکمل ادراک اس کے لیے ناممکن ہے، غور سے دیکھا جائے تو قرآنی آیات میں ایسے اشارات موجود ہیں، حسب ضرورت علل و حکم بھی بیان کیے گئے ہیں، سلسلۂ کلام میں احکامِ میراث اور اسلامی قانون شہادت سے متعلق آیات کا ذکر آ گیا تو آپ نے فرمایا کہ "اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں قانونِ میراث یا قانونِ شہادت میں کسی قسم کی تبدیلی کا مطالبہ کر رہا ہوں، میرے مضمون کی غرض یہ نہیں ہے، میں تو ایک کلامی مسئلہ سے بحث کر رہا ہوں کہ انسان کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے علم کا مکمل ادراک نہیں کر سکتا، آیاتِ الٰہی کا حقیقی مطلب وہی جانتا ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی کتاب کو ہر زمان و مکان کے لیے نامۂ ہدایت تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہمارا اس بات پر بھی ایمان ہو کہ وحیِ الٰہی میں ماضی و مستقبل کی تمام ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے اور جس طرح قدیم مفسرین نے اپنے زمانہ میں اپنے علم و فہم کے مطابق اس کا مفہوم متعین کیا ہے، اسی طرح حال اور مستقبل کے مفسر اپنے اپنے دور میں آیاتِ الٰہی کا مطلب بیان کرتے رہیں گے اور احکامِ الٰہی کے نفاذ میں ماحول کی رعایت اور زمان و مکان کے تقاضوں کا لحاظ رہے گا۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی نے اپنے مقالہ میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید یا علم کلام اور شریعت اسلامی کی نئی تعبیر کے تین محرکات: مرعوبیت، ترقی پسندی اور برسر اقتدار طبقہ کا دباؤ پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ "اسلام کوئی اقلیدس کا فرضی نقطہ یا کوئی ایسا مجرد نظام نہیں ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ رہا ہو، وہ کیمیا اور طبیعیات کے دوربینی اور خوردبینی مشاہدات

کی طرح نہیں ہے جن میں روزانہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بلکہ وہ انبیاءؑ کے مشاہدات ہیں جن میں لاکھوں برس سے کوئی فرق نہیں ہوا ہے۔" مولانا نے علم کلام اور شریعت اسلامی کی نئی تعبیر پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: "موجودہ دور میں ایک نئے علم کلام کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہے، مگر اصل سوال یہ ہے کہ اس کا دائرہ کار کیا ہوگا، میرے نزدیک نئے علم کلام کا کام یہ ہے کہ وہ اسلامی عقائد کی ایک ایسی صاف ستھری تعبیر کرے جس سے انسانی زندگی کے مادی اور روحانی پہلو باہم مربوط نظر آئیں۔ اختلاف اس میں نہیں ہے کہ شریعت میں اجتہاد کی گنجائش ہے بلکہ اختلاف اسکے دائرہ اختیار اور معاشرہ کی سیاسی و معاشی فلاح کے حدود کے تعین میں ہے۔"

مولانا برہان الدین سنبھلی نے تقلید کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا: "تقلید عام انسانوں کی ایک عملی ضرورت ہے اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ سواد اعظم بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہر انسان اکثر حالات میں "تقلید" ہی کی سواری پر اپنی زندگی کا سفر طے کرتا اور منزل سے ہمکنار ہوتا ہے۔" مجتہد ہونے کے لیے جن علوم میں مہارت کی ضرورت ہے انکی فہرست بتاتے ہوئے آپنے فرمایا کہ "ہر شخص کے بارے میں براہ راست قرآن وسنت سے احکام معلوم کر سکنے کی توقع رکھنا عملاً محال ہے، لیکن اس کے ساتھ موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ "بعض اوقات تقلید کے بارے میں غلو سے کام لیا گیا، حد اعتدال سے تجاوز کی بنا پر ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے متعدد علماء تقلید کو ناپسندیدہ بلکہ ناجائز قرار دینے پر مصر ہو گئے۔"

نئے ہندوستان میں اجتہاد کے دائرہ عمل پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے اپنے مقالہ میں فرمایا کہ "اجتہاد کا دائرہ عمل اسلامی مشن کے سیاق میں متعین کیا جائے تو اسکا مزاج اس اجتہاد سے جس پر آخری زمانے کے علماء نے قناعت کر لی تھی اور اس تجدد سے جس کا مظاہرہ بعض روشن خیال مفکرین کی طرف سے ہوتا رہتا ہے بالکل مختلف ہوگا۔ صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ اصل اہمیت دعوت کو دیا جائے اسلامی زندگی کو اسکا ذریعہ سمجھا جائے اور اجتہاد کا کام یہ قرار پائے کہ وہ ہندوستان کے موجودہ

حالات میں مسلمانوں کے لیے ایک فعال اور ترقی پذیر زندگی کے ایسے طور طریقے تجویز کرے جو اسلامی اصول زندگی کے زیادہ سے زیادہ آئینہ دار ہوں۔"

جناب انوار علی خاں سوز نے اپنی نئی اصطلاح نو راسخ العقیدگی کی وضاحت اس طرح کی:

"نو راسخ العقیدگی کی اصطلاح میں نے نو فلاطونیت (Neo-Platonism) اور نو کلاسکیت (Neo-classicism) کی مروجہ اصطلاحوں کی روشنی میں اختیار کی ہے۔ جیسا کہ نو راسخ العقیدگی کی لفظی ساخت ہی سے ظاہر ہے، میری مراد اس سے راسخ العقیدگی ہی ہے۔ مگر ایک نئے انداز کی راسخ العقیدگی۔ نو راسخ العقیدگی وہ نقطہ نظر ہے جو روایت سے انحراف کے بجائے روایت کی توسیع کا قائل ہے، جو دینی ورثہ کو کسی قیمت پر دریا برد کرنے کیلئے تیار نہیں ہے، لیکن قدامت پسندی کے باوجود متجددانہ انداز میں سوچنے کے لیے تیار ہے۔" آپ نے مزید فرمایا "نو راسخ العقیدگی پورے قرآن کو اللہ کا کلام اور تمام انسانیت کے لیے حجت سمجھتی ہے، مگر ہر مسلمان کو یہ حق بھی دیتی ہے کہ وہ اسے بطور خود اور بقدر استطاعت سمجھنے کی کوشش کرے بلا لحاظ اس کے کہ وہ روایتی معنوں میں عالم ہے یا نہیں۔"

جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے نظریۂ اجتہاد کو شرح و بسط کیساتھ بیان کرتے ہوئے فرمایا: جدید معاملات و مسائل کے لیے قرآن وسنت، تعامل صحابہ، اجماع امت اور فقہی نظائر و شواہد کی روشنی میں استنباط و استخراج احکام کا سلسلہ برابر جاری رہے گا اور اس طرح شریعت کے ذخیرے میں نشو و نما اور اضافہ ہوتا رہے گا، اور اس سلسلہ میں لوگوں کے سوالات کے تشفی بخش جواب دیے،

ڈاکٹر کرسچین ٹرال نے اپنے مقالہ میں سر سید احمد خاں کے مذہبی نقطہ نظر کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے کہا: "اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے ہندوستانی مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھیں اس بات کا احساس تھا کہ اسلامی علوم اور مذہبی ماخذ کا تنقیدی مطالعہ

کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان مغربی فلسفہ اور جدید سائنس کی طرف سے اپنی نظریں موڑ لے۔"

مولانا ابو العرفان ندوی نے فرمایا: "جس نظام قانون میں اجماع و قیاس کو استنباط و استخراج کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اسے جامد کس طرح کہا جا سکتا ہے، بدلتے ہوئے حالات میں جو نئے مسائل سامنے آئیں گے ان کو ہم قیاس و استحسان، عرف عام اور اجماعِ امت کے ذریعہ حل کریں گے، یہ کام ماضی میں بڑے پیمانے پر ہوا ہے، اور انفرادی حیثیت سے اب بھی ہو رہا ہے، لیکن اس کام کے لیے علم و صلاحیت کی ضرورت ہے، میرے خیال میں کتاب و سنت کی حدود کے اندر زمانہ کی ضروریات کے مطابق مسائل میں تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن یہ کوشش تعمیر کے لیے ہونی چاہئے تخریب کے لیے نہیں۔"

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ناظم دار المصنفین نے اپنے مقالہ میں یہ پیش کیا کہ اگر تصوف کو کھلے دل سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو پھر اس میں کسی کو شبہہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے ذریعے ہر زمانہ میں اسلامی طرز فکر کی تشکیل ہوئی ہے، اور آج بھی یہ اسلامی طرز فکر کو متاثر کر سکتا ہے، انھوں نے تصوف کو ایک روحانی ضابطۂ اخلاق قرار دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس روحانی اخلاق کے ذریعہ سے اسلامی طرزِ فکر کی نئی تشکیل میں آسانی ہو سکتی ہے، اور اگر اسی روحانی اخلاق کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا جائے تو اسلامی اخلاق کا ایک اعلیٰ روحانی فلسفہ بھی مرتب ہو سکتا ہے، انھوں نے اپنے مقالہ میں اقبال کے تصوف پر روشنی ڈالی اور بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ ان کے یہاں مصدر حیات، مقصود حیات اور لامتناہی حیات کے تخیل میں جو صبغۃ اللّٰہی رنگ ہے وہ نطشے، کانٹ، شوپنہار، جیمس وارڈ اور ولیم جیمس وغیرہ کے ذریعہ سے نہیں آیا بلکہ پیر رومؒ کے صوفیانہ اور عارفانہ خیالات کے مطالعہ سے آیا، آخر میں یہ کہا کہ اگر یہ دانائے راز، ناہید نفس شاعر اور مشرق کو خواب گراں سے بیدار کرنے والا فلسفی صوفیائے کرام کی تعلیمات سے متاثر ہو سکتا ہے تو پھر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اگر موجودہ دور میں کسی میں حضرت ابو الحسن علی ہجویریؒ

کا تفکر، خواجہ معین الدینؒ کا پیغام حق، حضرت بختیار کاکیؒ کا حبِّ رسول، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی صلاحیتِ دل، شیخ نظام الدین اولیاؒ کا حقوق العباد، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا جذب و سلوک، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے ادراک، تقویٰ اور معرفت نفس، سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی تسلیم و رضا، حضرت خواجہ گیسو درازؒ کا تزکیۂ اخلاق، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دعوت و عزیمت اور خود ڈاکٹر اقبالؒ کے عشق کی نوائے زندگی اور سوز دمبدم جمع ہو جائیں تو اس سے نئے ہندوستان میں اسلامی طرز فکر کی ایسی نئی تشکیل ہو سکتی ہے جس سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ اس ملک کے معاشرتی بلکہ سیاسی زندگی میں بھی ایک نئی روح اور زندگی پیدا ہو سکتی ہے۔

مولانا سعید احمد پالنپوری نے اپنے مقالہ میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی وجوہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "اب استدلال میں عقلی دلائل کی جگہ محسوسات کو زیادہ پسند کیا جانے لگا ہے، اس لیے تشکیل نو میں ضروری ہے کہ دلائل و براہین کا پیرایۂ بیان بدلا جائے"۔ اسلامی فکر کا اصل سرچشمہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ ہیں، ان میں جو فکر بسیط انداز میں بیان کی گئی ہے اسے علمی اور فنی حیثیت سے سامنے لانا چاہئے، اس میں تعبیر کی حد تک تو تغیر و تبدل گوارا ہو سکتا ہے مگر اس میں ہماری فکر کی دخل اندازی کسی طرح برداشت نہیں کی جا سکتی اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جبکہ فہم قرآن و حدیث کے اصول موضوعہ سے صرف نظر نہ کیا جائے۔ اگر کوئی نیا اجتہاد ناگزیر ہو تو وہ بھی اسی دائرہ میں رہ کر کیا جائے، ایسا اجتہاد جس سے فکر اسلامی کی ساری گذشتہ بساط ہی الٹ جائے کسی طرح مناسب نہیں ہے، اجتہاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ماضی سے فکری رشتہ کاٹ لیا جائے، تمام مجتہدین امت نے ہمیشہ ماضی سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے، کیونکہ ایسا کرنے ہی سے نئے مجتہدات اصل سرچشمہ سے منسلک ہو سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر طاہر محمود نے عرب ممالک کے قوانین میں جو تبدیلیاں وقتاً فوقتاً کی گئی ہیں انھیں اختصار کے ساتھ بیان کیا،

پروفیسر ڈاکٹر مقبول احمد نے روایت اور تجدد کے موضوع پر اپنا مقالہ سنایا جس میں قدیم نقطۂ نظر کے ساتھ غور و فکر کی غرض سے کچھ جدید پہلوؤں کا ذکر بھی کیا، یہ مقالہ دلچسپی سے سنا گیا، آخر میں حاضرین کے استفسار پر مقالہ نگار نے مجمل بیانات کی تفصیل پیش کی اور کہا کہ کتاب و سنت اصل بنیاد ہیں، جو کچھ بھی رائے قائم کی جائے گی اور جو مسائل مستنبط کیے جائیں گے ان میں اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ کتاب و سنت سے انحراف نہ ہو۔

حسن الدین صاحب کے مقالہ کا عنوان حاضرین کو مناسب نہیں معلوم ہوا، مندرجات بھی محل نظر محسوس ہوئے، احادیث کے سلسلہ میں جو کام اب تک ہوا ہے اس سے لوگوں نے انھیں باخبر کیا،

جناب ڈاکٹر رفیق سید شعبۂ سوشل ورک جامعہ نے انگریزی میں اسلام میں فکر کی تشکیل نو پر عمرانی نقطۂ نظر سے ایک جچا تلا مضمون سنایا،

جناب رحمت علی صاحب صدر شعبۂ معاشیات جامعہ کا مقالہ اسلام اور دولت کی منصفانہ تقسیم پر دلچسپی سے سنا گیا،

اختصار کے باعث صرف چند مقالات کے انتخابات ہی دیے جاسکے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اور قدیم طرز کی درسگاہوں کے فارغ التحصیل دونوں طبقوں کے خیالات کی حتی الوسع نمایندگی ہو جائے، ادارہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے جب مفصل رپورٹ چھپے گی تو ناظرین مقالات اور ان پر بحث و مباحثہ کی پوری روداد پڑھ سکیں گے۔

علمی جلسوں کے بعد ۲۹ دسمبر ۱۹۷۷ء کو ساڑھے گیارہ بجے دن میں شیخ الجامعہ

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی صدارت میں ایک کاروباری جلسہ ہوا، اس میں انھوں نے مختصر الفاظ میں سمینار کے موضوع کے بارہ میں اپنے خیالات ظاہر کیے اور اس کی کامیابی پر مندوبین اور منتظمین کو مبارکباد دی۔ اس کے بعد سمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے حسب ذیل تجاویز پیش کیں جو بالاتفاق منظور کی گئیں،

۱۔ صحیح فکر اسلامی کی اساس ہر دور میں کتاب و سنت رہی ہے، وہ اسلامی عقائد جن کی ہمارے اسلاف نے قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کی ہے، ہمارا دینی سرمایہ ہیں، آج بھی فکر اسلامی کا جو نقشہ مرتب ہوگا وہ کتاب و سنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان ہی خطوط پر ہوگا۔

۲۔ مفکرین اسلام، فقہاء، اور مجتہدین نے ہمیشہ زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے، آج بھی مذکورہ اصولوں کی روشنی میں جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنا اور ان کا قابل قبول حل ...... تلاش کرنا ہے،

۳۔ یہ عہد علم و فن کی دنیا میں تخصیص کا عہد ہے اور بہت سے نئے علوم وجود میں آ گئے ہیں، اور دینی مدارس اور جدید درسگاہوں سے آج ایسے رجال کار نہیں نکل رہے ہیں جو بیک وقت قدیم و جدید علوم میں رسوخ رکھتے ہوں، بہتر صورت تو یہ ہوتی کہ دینی مدارس کے احاطوں میں ہی ایسا انتظام ہوتا کہ مختلف دینی و دنیوی علوم کے ماہرین فن پیدا ہوتے لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے، اس لیے سمینار کے شرکاء اس بات پر متفق تھے کہ جب تک علماء اور جدید طرز کی تعلیم پائے ہوئے دانش ور دونوں مل کر فکر اسلامی کی تعبیر نو اور ایک جدید علم کلام کی تشکیل و تدوین کا کام ہاتھ میں نہیں لیں گے اس وقت تک اس سلسلہ میں کوئی ایسی پیش رفت ممکن نہ ہو سکے گی جسے اعتبار اور سند حاصل ہو۔

۴۔ سیمینار میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ جس طرح جامعہ ملیہ کے اس سیمینار میں قدیم اور جدید طرز کے عالموں اور دانشوروں کو تبادلۂ خیال کا موقع ملا ہے، اسی طرح دوسرے تعلیمی اداروں میں ایسے مواقع کی صورت نکالی جائے تاکہ دونوں طبقوں میں تبادلۂ خیال باربار ہوتا رہے، اور عصر حاضر کے مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے میں آسانی ہو،

۵۔ سیمینار میں شریک تمام مندوبین اس بات کے حق میں تھے کہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز دونوں طبقوں کے نمائندہ حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کرے جو مذکورہ مقاصد کے حصول کے لیے ایک پروگرام اور لائحہ عمل تیار کرے، اس سلسلہ میں یہ بھی طے پایا کہ کمیٹی کام کا جو نقشہ مرتب کرے اس میں سرِ فہرست اولیت مندرجہ ذیل امور کو حاصل ہو:

(الف) مختلف لوگوں کے دماغوں اور خاص طور سے جدید ذہنوں میں مذہب اور اسکی ضرورت سے متعلق جو سوالات اٹھتے رہتے ہیں ان سے متعلق ضروری معلومات فراہم کیجائیں اور انکے جواب جدید علم کلام میں شامل کیے جائیں۔

(ب) علوم عصریہ اور مغربی تہذیب و تمدن کی وہ بنیادیں متعین کیجائیں اور واضح کیجائیں جو اسلامی عقائد، اسلامی تہذیب کے اصولوں اور روح اسلام کے تقاضوں سے متصادم اور متخالف ہیں ان کی تنقیح و تنقید کیجائے اور ان سے متعلق سیر حاصل بحث کر کے کسی قابل قبول نتیجہ تک پہنچا جائے، اس مسئلہ کو بھی جدید علم کلام کا موضوع بنایا جائے۔

(ج) اسلامی عقائد و اعمال میں سے جو مسائل مسلمانوں یا غیر مسلموں میں موضوع بحث بنے ہوئے ہیں مثلاً مسلمانوں کی عائلی زندگی، بنک کاری، اسٹاک ایکسچینج اور مساواتِ مرد و زن اور حسن و قبح اشیاء کی عقلی و شرعی حیثیت وغیرہ۔ ان سے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں ملک و ملت کی صحیح رہنمائی کیجائے۔

اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سیمینار کی تجاویز

از ڈاکٹر انوار الحق حقی، صدر شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سیمینار کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی اسی انداز کا ایک سیمینار ہوا جس کا افتتاح مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کیا، اس کی پوری روداد تو معارف کیلئے ابھی تک موصول نہیں ہوئی ہے، لیکن معلوم ہوا کہ جناب انوار الحق حقی صاحب، صدر شعبۂ سیاسیات مسلم یونیورسٹی اور ان کے شرکائے کار کی خوش انتظامی کی بدولت یہ سیمینار بہت کامیاب رہا، یہ راقم اپنی علالت کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکا، جس کا بڑا افسوس ہے، اس سیمینار میں جو تجاویز منظور ہوئی ہیں وہ جناب حقی صاحب نے یہاں بھیجی ہیں، ناظرین معارف کیلئے ذیل میں درج کیجاتی ہیں۔ "ص ع"

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کی جانب سے ایم، اے، او کالج کی صد سالہ تقریبات کے دوران "اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں" کے موضوع پر ۲۲ جنوری تا ۲۵ جنوری ۱۹۷۷ء ایک سیمینار منعقد ہوا، اس سیمینار میں علما، مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے حصہ لیا، جن میں علی گڑھ کے وائس چانسلر جناب علی محمد خسرو صاحب کے علاوہ محترم جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب، جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب، جناب بدرالدین طیب جی صاحب اور جناب ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب بھی شامل ہیں، سیمینار کے مباحثوں میں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، جامعۃ الرشاد، جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، وشوا بھارتی یونیورسٹی، مرٹھواڑ یونیورسٹی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، کلکتہ یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اور خود مسلم یونیورسٹی کے نمائندے شریک رہے۔

سمینار میں مذہب، قانون، سیاست، معیشت اور تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر جدید حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی تعلیمات سے متعلق چالیس سے زائد مقالے پیش کیے گئے اور ان مباحث پر تفصیلی مذاکرہ رہا، اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ دنیا کے تغیرات کے تفصیلی جائزے اور تجزیے کا عمل جاری رہنا چاہیے، اور تغیر کے مطالبے کے ساتھ یہ بھی تحقیق ہونا چاہئے کہ انسانی زندگی میں کون سے عناصر کو ثبات حاصل ہے، زندگی ثبات و تغیر دونوں سے عبارت ہے، اور فکر و عمل میں دونوں ہی کی رعایت ملحوظ رکھنا ضروری ہے، زندگی کا متوازن لائحہ عمل وہی ہے جو تغیرات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ فطرت کے پائیدار عناصر اور زندگی کے دائمی تقاضوں کو بھی پورا کرتا رہے،

ربانی ضابطۂ ہدایت میں ثبات و تغیر دونوں کی مناسبت سے ایک طرف کچھ منصوص اور ناقابل ترمیم احکام دیے گئے ہیں تو دوسری طرف تمدنی زندگی کے متعلق اصولی ہدایات دی گئی ہیں، جنھیں بدلتی ہوئی دنیا میں نئی تعبیر و تطبیق کے ذریعے نئے مسائل کے حل کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے،

مباحثے کے بعد مندوبین سمینار جن نتائج پر پہنچے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلامی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ پیش آنے والے مسائل کے بارے میں اجتہاد کے ذریعے اسلامی ہدایات سے اخذ و استنباط کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے، پچھلے

سو سال میں مختلف عوامل کی بنا پر عمل اجتہاد میں ایک نئی زندگی نمایاں ہے،

(۲) اسلام کے اصول اجتہاد اس بات کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں کہ جدید مسائل کے حل میں مددگار ثابت ہو سکیں۔

(۳) اسلام نے سیاست و حکمرانی کے لیے جو اصولی ہدایات دی ہیں انھیں آج بھی ہمارا رہنما ہونا چاہیئے، قانون الٰہی کی برتری، باہمی مشورے کے ذریعہ فیصلہ، آزادی ضمیر وغیرہ ایسے اسلامی اصول ہیں جنھیں نئے حالات میں نئے طریقوں سے زیر عمل لانا چاہیئے۔

(۴) اسلام عدل کے ساتھ ترقی کے قومی محرکات فراہم کرتا ہے، اور اس میں عوام کی فعّال شرکت کا ضامن ہے۔

(۵) معاشی ترقی کی اسلامی راہ کا تقاضا ہے کہ مسلمان اقوام بیش از بیش باہمی تعاون کا طریقہ اختیار کریں اور ان ممالک کو بھی اس عمل میں شریک کریں جو شمالی افریقہ، مغربی ایشیا، جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں ان کے پڑوسی ہیں،

(۶) ماضی قریب کی مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کے فیض سے اب عالم اسلام میں ایک عام فکری بیداری پیدا ہو چلی ہے، متعدد اسلامی تحریکات اور اسلامی ادب کے جدید رجحانات ایک خوش آیند مستقبل کے آئینہ دار ہیں۔

(۷) مغربی علوم و افکار نے جہاں بعض ناپسندیدہ نقوش علم و ثقافت کی دنیا پر مرتسم کیے ہیں وہیں علم و تحقیق کی بعض نئی راہوں کی طرف اشارے بھی کیے، انکے صالح اثرات کو جذب کرنا اور غیر صالح اثرات پر نقد و نظر کا عمل کرنا حکمت دینی کا تقاضا ہے، ہر حکمت کی بات ملتِ اسلام ہی کی متاعِ گمشدہ ہے۔

(۸) ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ حالت اور ضروریات کے پیش نظر اوقاف

کی اصلاح وترقی کے لیے اور انھیں مفید تر بنانے کے واسطے سنجیدہ کوشش کی ضرورت ہے۔

مزید برآں مندوبین نے ذیل کے عملی اقدامات پر بھی اتفاق رائے کیا :۔

(۱) ہندوستانی مسلمانوں کے نظام تعلیم کی اصلاح وترقی اور تعلیمی مسائل پر اجتماعی طور سے غور کرکے عملی تجاویز مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کیجائے۔

(۲) جہاں تک ممکن ہو دینی درسگاہوں کے نصاب میں جدید علوم وافکار کو بھی مناسب جگہ دی جائے، اور اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ جدید علوم کے واقفکار متعلقہ امور میں دینی رہنمائی اور اسلامی علوم سے بہرہ ور ہوسکیں، اس سلسلے میں مرکزی اہمیت رکھنے والی درسگاہوں سے ضروری تعاون حاصل کیا جائے۔

(۳) جدید تمدن اور معیشت کے پیداکردہ مسائل مثلاً انشورنس، حکومتی قرضے اور بنکنگ پر اسلامی تعلیمات اور موجودہ حقائق کی روشنی میں خصوصی طور سے غور وفکر کیا جائے، اور رہنمائی فراہم کی جائے۔

(۴) اس سیمنار سے حاصل ہونے والے فوائد کے پیش نظر اس کی کوشش کی جائے کہ آیندہ بھی مختلف اداروں کی جانب سے ایسی مجالس مذاکرہ کا اہتمام کیا جاتا رہے۔

اسلام کا سیاسی نظام

اس میں کتاب وسنت کی روشنی میں اسلامی سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے، اٹھارہ[۱۸] ابواب میں نظریۂ خلافت، مجلس تشریعی، طریقۂ قانون سازی، حقوق رعایا، بیت المال، احتساب، حرب ودفاع، خارجی معاملات وغیرہ غرض اسلامی دستور کے تمام اصول اور اساسی پہلو آگئے ہیں، آخری باب میں موجودہ سیاسی نظریات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

مؤلفہ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی۔ ضخامت ۳۰۰ صفحے۔ قیمت لعہ ۹ پیسے ۔ منیجر

مطبوعات جدیدہ

بجھتے چراغ :۔ مرتبہ جناب محمد اکبرالدین صدیقی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، صفحات ۲۸۶ ۔ مجلد مع گرد پوش، قیمت عـہ ۱۸ پتہ: چار کمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲ آندھراپردیش۔

اردو کی خدمت وترقی میں دکن کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، ڈاکٹر زور، مولوی نصیرالدین ہاشمی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم دکن کے خدمات ادب پر بڑا کام کرچکے ہیں، جناب اکبرالدین صدیقی کا تعلق بھی اسی خطہ سے ہے اسلئے وقتاً فوقتاً وہ مختلف رسالوں میں دکنی ادب پر مضامین لکھتے رہے ہیں، اب انھوں نے اس قسم کے تیئیس[۲۳] مضامین کا یہ مجموعہ کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اکثر مضامین میں دکن کے قدیم شعراء، خواجہ بندہ نواز، برہان الدین جانم، نصرتی، وجہی، حاتمی اور طبعی وغیرہ کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ کلام پر بحث اور ان کی غزل گوئی، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی نگاری پر تبصرہ کیا گیا ہے، چند مضامین میں بعض امرائے دکن کی علم نوازی، اہل بیجاپور کی ادبی اور خواجہ بندہ نواز کے سلسلہ کے بزرگوں کی علمی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، ایک مضمون میں لچھمی نارائن شفیق کے ایک نادر وکمیاب "تذکرہ شام غریباں" کا تعارف ہے اور ایک مضمون بیجاپور کی امین درگاہ کے کتبہ کے متعلق ہے، یہ سب مضامین تلاش ومحنت سے لکھے گئے ہیں، اور ان سے دکن کے قدیم ادبی وعلمی کارناموں کے بعض پہلو سامنے آتے ہیں، اس حیثیت سے یہ دکنی ادب پر ایک اچھی کتاب ہے، مصنف اردو کے کہنہ مشق اہل قلم ہونے کے علاوہ متعدد کتابوں کے

مصنف اور ماہنامہ سب رس کے اڈیٹر بھی ہیں، مگر اس کے باوجود انھوں نے زبان و بیان کی صحت کا خیال نہیں رکھا، مثلاً اس کی توضیح و تشریح اس تعلیمات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے (ص ۲۴) اور چونکہ حضرت جانم کی عمر اس وقت اٹھارہ تا بیس سال ہو تو آپ کی پیدائش کا سنہ ۸۸۴ھ تا ۸۸۶ھ ہوگا" (ص ۳۱) جس سے ۸۸۴ھ مستخرج ہوتے ہیں (ص ۳۷) وہاں زیارت کی کسی مرد آدمی کو اجازت نہیں ہے (ص ۳۸) حضرت برہان الدین نے ...... حضرت امین الدین اعلیٰ کی تعلیم و تربیت اور اتالیقی انھیں کے تفویض کی تھی (۳،۴) ڈاکٹر حفیظ سید مرحوم نے الہ آباد یونیورسٹی کے رسالے میں شائع کر رہا ہے (ص ۵۵) اپنے والد کے وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے (ص ۶۲) میں ایسی زمین خرید نا چاہتا ہوں جو اکل حلال سے خریدی ہوئی ہے (ص ۸۲) جو چیزیں آپنے رکھ چھوڑی ہیں اس میں کیا اسرار ہے (ص ۸۳) اس کا اردو کلیات ابھی تک بھی دستیاب نہ ہو سکا (ص ۱۰۰) حضرت نے بھنگ کی بجائے پانی یا شربت کا پیالہ عنایت کیا (ص ۱۱۳) خالص فارسی الفاظ کی بجائے (ص ۱۱۳) جو مخطوطے کتب خانوں میں دستیاب ہوتے ہیں، وہ تحریف و تصرف کے اندیشے سے خالی نہیں ہیں (ص ۱۳۱) مزید تین مراثی الامی اعلیٰ اور غلامی کے مرثے بھی پیش ہیں (ص ۲۰۴) امیدی کا یہ قصہ اچھی اور طبع زاد ہے (ص ۲۱۳) بحری کی چار غزلوں کی تضمین کی ہے (ص ۲۲۶) یہ غزل یہاں کے کتب خانوں میں بیاضوں میں بھی موجود ہے (ص ۱۳۲) اپنے مریدوں کو تعلیم و تدریس کیلئے فارسی کیسا تھ اس زبان کو اپنایا (ص ۲۳۵) جس کے تین مثنویاں ملتی ہیں (ص ۲۴۰) وجدی کے مثنویاں (ص ۵۱) اپنے دربار میں متعین کر لیا (ص ۲۵۲) شفیق کے اجداد کا تعلق لاہور سے تھا وہ اورنگزیب عالمگیر کے ہمراہ دکن آئے (ص ۲۷۰) مشائخ و عمائد جمع ہیں مگر مصنف نے مشائخوں، مشائخین اور عمائدین لکھا ہے، اور مشائخ کو واحد استعمال کیا ہے، جیسے "یہاں کے ایک مشائخ" (ص ۱۵۹) لکھتے ہیں "یہ مثنوی چھپ چکی ہے، ڈاکٹر زور مرحوم نے اسکو مرتب کیا تھا ابھی منظر عام پر نہ آسکی" (ص ۲۴۰) چھپنے کے باوجود منظر عام پر نہ آنے کا کیا مطلب ہے۔ وہ لکھتے ہیں "سال کے ۳۶۰ دن کے مطابق" (ص ۲۱۵) قمری سال ۳۵۵ اور شمسی سال ۳۶۵ یا ۳۶۶ دن کا ہوتا ہے۔ انکے علاوہ بھی غلطیاں ہیں، ممکن ہے کچھ کتابت و طباعت کی بھی ہوں۔ قیمت بھی زیادہ ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۰ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۷ء عدد ۳

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

......٭......